اقبالیات (اردو)

جولائی تا ستمبر، ۱۹۹۳ء

مدیر:
پروفیسر محمد منور

اقبال اکادمی پاکستان

عنوان	:	اقبالیات (جولائی تا ستمبر ۱۹۹۳ء)
مدیر	:	محمد منور
پبلشرز	:	اقبال اکادمی پاکستان
شہر	:	لاہور
سال	:	۱۹۹۳ء
درجہ بندی (ڈی۔ڈی۔سی)	:	۱۰۵
درجہ بندی (اقبال اکادمی پاکستان)	:	8U1.66V11
صفحات	:	۱۳۸
سائز	:	۵ء۲۴×۵ء۱۴س م
آئی۔ایس۔ایس۔این	:	۰۰۲۱-۰۷۷۳
موضوعات	:	اقبالیات
	:	فلسفہ
	:	تحقیق

IQBAL CYBER LIBRARY

(www.iqbalcyberlibrary.net)

Iqbal Academy Pakistan

(www.iap.gov.pk)

6th Floor Aiwan-e-Iqbal Complex, Egerton Road, Lahore.

مندرجات

جلد: ۳۴ | اقبالیات: جولائی تا ستمبر، ۱۹۹۳ء | شمارہ: ۲

اقبالیات

جولائی۔۔۔ستمبر 1993ء

مدیر

پروفیسر محمد منور

اقبال اکادمی پاکستان

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

☆

مقالات کے مندرجات کی ذمہ داری مقالہ نگار حضرات پر ہے ۔ مقالہ نگار کی رائے اقبال اکادمی پاکستان لاہور کی رائے تصور نہ کی جائے ۔

یہ رسالہ اقبال کی زندگی، شاعری اور فکر پر علمی تحقیق کے لیے وقف ہے اور اس میں علوم وفنون کے ان تمام شعبہ جات کا تنقیدی مطالعہ شائع ہوتا ہے۔ جن سے انھیں دلچسپی تھی مثلاً اسلامیات اسلامیات، فلسفہ، تاریخ، عمرانیات، مذہت، ادب، آثاریات وغیرہ۔

معتمد مجلس ادارت، اقبالیات ۱۱۶ میکلوڈ روڈ لاہور (فون: ۳۵۷۲۱۴)

کے پتے پر ہر مضمون کی دو کاپیاں ارسال فرمائیں ۔ اکادمی کسی مضمون کی گمشدگی کی کسی طرح بھی ذمہ داری نہ ہوگی ۔

بدل اشتراک

پاکستان

فی شمارہ	۳۰ روپے
زرسالانہ	۱۰۰ روپے (چار شمارے)

بیرونی ممالک

اداروں کے لیے	۱۵ ڈالر
فی شمارہ	۴ ڈالر

(بشمول ڈاک خرچ)

ناشر: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور، فون: ۳۵۷۲۱۴

☆

قلمی معاونین

پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض   چیئر مین شعبہ اقبالیات، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل   استاد شعبہ اردو جامعہ کراچی، کراچی۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد اختر چیمہ   صدر، شعبہ فارسی گورنمنٹ کالج، فیصل آباد

اکبر حیدری کشمیری   حیدر آباد (دکن) بھارت

ڈاکٹر طارق سلیم خان   استاد شعبہ عربی اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور۔

اقبال کے دو غیر مدون خط

ڈاکٹر معین الدین عقیل

اقبال کے نادر و غیر مطبوعہ اور غیر مدون خطوط کی تلاش و تحقیق اور دستیابی ایک عرصہ سے اقبالیات کے متعدد نئے گوشے وا کر رہی ہے۔ پھر مکاتیب اقبال کی ترتیب و تدوین کی حالیہ کوششیں بھی عہد جدید کے تقاضوں کیمطابق اقبالیات کے معیار اور اس کے متعلقہ موضوعات کو ان کے بنیادی ماخذ ہونیکی حیثیت میں قابل استعمال بنانے کے لیے معاون ثابت ہوئی ہیں۔

ذیل میں اقبال کے دو غیر مدون خطوط کے اقتباس نقل کیے جا رہے ہیں جو اقبال نے سجاد مرزا بیگ دہلوی کے نام تحریر کیے تھے۔ یہ خطوط اب مکمل طور پر تو دستیاب نہیں لیکن انکا نفس مضمون چونکہ شائع ہو گیا تھا۔ اس لیے بس یہی دستیاب مطبوعہ متن اقبال کے گمشدہ آثار کی بازیافت کے طور پر اقبالیات کے ذیل میں ایک تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے مکتوب الیہ محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے انجمن ترقی اردو کے زیر ہدایت مرتبہ اردو مطبوعات کی اولین ضخیم فہرست الفہر ست کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

محمد سجاد مرزا بیگ 1876ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ اسلاف میں اہل سیف اور اہل قلم دونوں طرح کے بزرگ شامل تھے اور 1857ء سے قبل قلعہ معلی سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن انقلاب 1857ء کے بعد ان کے والد محمد مرزا بیگ نے انگریز کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد سجاد مرزا بیگ تلاش روزگار میں دہلی سے حیدر آباد منتقل ہو گئے جہاں 1915ء ''نظام کالج'' میں اردو کے استاد کی حیثیت میں ان کا تقرر ہو گیا۔

اپنے اساتذہ کے زمرے میں سجاد مرزا بیگ نے حافظ اخوند محمد عمر (۲) اور نواب بشیر الدین احمد خاں (۳) کے نام تحریر کیے ہیں (۴)۔ اور احباب میں متعدد

اہم نام نظر آتے ہیں مثلاً مولوی سید احمد دہلوی (مرتب ل، فرہنگ آصفیہ) (۵) اور مولانا محمد علی جوہر۔علی برادران نے جب حرمت وحفاظت حرمین شریفین کے لیے۔انجمن خدام کعبہ، قائم کی تو سجاد مرزا بیگ حیدرآباد میں اس کے قیام وفروغ کے لیے کوشاں ہوئے۔ان کی تصنیف ''شمع راہ'' میں جوان کے خطبات کا مجموعہ ہے، اولین خطبہ ان کے اسی تعلق اور جزبے کا مظہر ہے۔(۶) اداروں میں سے وہ ''نظام کالج'' کے علاوہ ''جامعہ عثمانیہ'' اور ''انجمن ترقی اردو'' کے رکن رہے (۷)۔

ان کی علمی و تصنیفی خدمات کے صلے میں نظام حیدرآباد نے ۱۹۱۸ء میں انھیں دو سو روپے ماہوار وظیفہ کیا (۸) پھر اپنی تصانیف ''تسہیل البلاغت'' ''الاستدلال'' اور الفہرست'' چونکہ انھوں نے نظام حیدرآباد کے نام معنون کی تھیں۔اس لیے نظام نے ۱۳۲۷ء ۱۹۰۹ء میں انتساب کی اجازت دیتے ہوئے ان کتابوں کی اشاعت کی مد میں ڈھائی ہزار روپے انھیں عنایت کیے اور مزید پانچ سال تک دو سو روپے ماہانہ وظیفہ ان کینام جاری کر دیا۔۱۳۴۰ھ ۱۹۲۱ء میں اس وظیفے کو اضافے کیساتھ تاحیات کر دیا گیا (۹) ان اعزازات اور اپنی علمی و ادبی خدمات کے صلے میں اکابر کی ستائش کے علاوہ سجاد مرزا بیگ حیدرآباد میں ہجو اور تنقید کا نشانہ بھی بنے۔صدق جائسی (۱۰) نے اپنی خودنوشت یادداشتوں، دربار دربار میں ان پر تحریر کردہ اپنی ایک منظوم ہجو نقل کی ہے اور اس کا پس منظر بھی بیان کیا ہے (۱۱)۔

انکی کئی تصانیف اپنے موضوعات پر اردو میں نصابی کتب کی عدم موجودگی یا کمیابی کے سبب چونکہ طلبہ کی نصابی ضرورتوں کی تکمیل بھی کرتی تھیں۔اس لیے نصاب میں بھی شامل کی گئیں۔مثلاً حکمت عملی'' ۱۳۴۵ھ ۱۹۲۶ء میں انٹرمیڈیٹ کے نصاب کے لیے منظور کی گئی (۱۲)۔ان کی تصانیف میں ''الفہرست''، تسہیل البلاغت'' ''الاستدلال'' ''شمع راہ'' اور حکمت عملی'' کے علاوہ ''تمنائے دید'' ''الانسان'' اور شمع ہدایت'' کے نام بھی ہیں۔ان تصانیف کی صراحت موضوعات کے

لحاظ سے درج ذیل ہے۔

ا۔ ''تمنائے دید''

اس میں قصے کے پیرائے میں زندگی کے نشیب وفراز اور اخلاق و معاشرت کے مسائل پیش کیے گئے ہیں۔ اسے ''مخزن ادب'' (دہلی) نے شائع کیا تھا۔ ان کے فرزند صفوۃ اللہ بیگ صوفی نے اپنی مرتبہ ''مفصل فہرست تصانیف پروفیسر سجاد مرزا بیگ میں سے پروفیسر صاحب کے اوائل عمر کی تصنیف بتایا ہے (۱۳)

۲۔ ''حکمت عملی''

پہلی مرتبہ ''قاسم پریس'' حیدرآباد دکن سے ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ فلسفہ عمل، قومی ترقی اور حصول عزت کے موضاعات پر مبنی اور ایک مقدمے اور تین مقالات پر مشتمل ہے۔

۳۔ ''الانسان''

یہ علم اخلاق، مذہب، معاشرت وتمدن کے فلسفے اور انسان کے قوائے جسمانی و نفسانی اور خصوصیات و مزاج کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ '' مکتبہ اختر دکن'' حیدرآباد سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی۔

۵۔ الفہرست''

مولوی عبدالحق کی فرمائش پر انجمن ترقی اردو کے ایک منصوبے کے تحت یہ ایک ضخیم کتابیات مرتب کی گئی تھی جو مختلف موضوعات اور علوم وفنون پر اردو میں شائع ہونے والی مطبوعات کی فہرست ہے۔ یہ نظام دکن پریس حیدرآباد سے ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔

٦۔ ''تسہیل البلاغت''

حیدرآباد دکن سے ۱۳۳۹ھ ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ دراصل ''نظام کالج''

میں دوران تدریس علم البلاغت کی تحصیل میں مدد دینے کے لیے دیے جانیوالے خطبات کا مجموعہ ہے جو علم معانی، بیان بدیع اور بلاغت کے تقریبا تمام اہم موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔

۷۔ "شمع راہ"

مختلف مجالس میں مختلف موضوعات پر دیے جانے والے خطبات کا مجموعہ ہے جسے ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند صفوۃ اللہ بیگ صوفی نے دفتر کتابت سجاد منزل دہلی سے ۱۹۳۶ء میں شائع کیا تھا (۱۴)۔

سجاد مرزا بیگ نے ۲ فروری ۱۹۴۷ء کو بعارضہ فالج حیدر آباد میں انتقال کیا۔ انکی وفات کے بعد ان کے فرزند صفوۃ اللہ بیگ صوجی نے "مفصل فہرست تصانیف پروفیسر سجاد مرزا بیگ" شائع کرتے ہوئے (۱۵) اس کے آ کر میں اپنے والد کے مکاتیب اور مضامین بھی شائع کرنے کا اعلان کیا تھا، لیکن راقم کو ان کی اشاعت کا علم نہیں۔ یہ "مفصل فہرست تصانیف..... حکمت عملی" "الانسان" "تسہیل البلاغت" پر اس وقت کے اا کابر علم و ادب کی آراء بطور تقاریظ جمع کی گئی ہیں ان اکابر کے نام یہ ہیں شبلی، حالی، مولوی، ذکاء اللہ، علامہ اقبال، عزیز مرزا، ہمایوں مرزا، کپتان نواب ممتاز یار الدولہ بہادر، مولوی محمد محسن فاروقی۔ ڈاکٹر سید سراج الحسن، عماد الملک سید حسین بلگرامی، پروفیسر محمد نعیم الرحمٰن، مولوی سید احمد دہلوی اور ڈاکٹر محمد بدل الرحمٰن۔

ان اکابر میں سے بالخصوص شبلی، حالی، اور اقبال کی غیر مدون تحریریں ان کی مختلف النوع نگارشات کے مجموعوں یا دیگر صورتوں میں منظر عام پر آتی رہی ہیں شبلی نے "حکمت عملی" کے بارے میں جو رائے دی ہے۔ (۱۶) وہ ان کی اس طرح کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ اور اسی طرح اقبال نے "حکمت عملی" اور "الانسان" کے بارے میں مصنف کو جو خط لکھے تھے، وہ بھی ان کے ایسے کسی مجموعے میں موجود نہیں۔ اقبال نے اپنی یہ آراء سجاد مرزا بیگ کے نام دو مختلف خطوط میں دی ہوں

گی۔ان خطوط کے تحریر کیے جانے کی تاریخوں کا اندازہ نہیں ہوتا۔یہ کہا جا سکتا ہیکہ یہ خطوط متعلقہ کتابوں کی اشاعت علی الترتیب ۱۹۰۶اور ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۷ء میں سجاد مرزا بیگ کے انتقال تک، کسی وقت لکھے گئے۔

اقبال کے ان خطوط کے اقتباسات جو مذکورہ ''فہرست'' میں اسی طرح درج ہیں ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ''حکمت عملی''

میں نے آپ کی تصنیف ''حکمت عملی'' کوشروع سے آخر تک پڑھا،نہایت عمدہ اور دلچسپ کتاب ہے۔خصوصاعورتوں کی تعلیم کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا، نہایت مناسب اور اسلامی اصول تمدن کے عیب مطابق ہے۔میں خیال کرتا ہوں کہ شاید اردو زبان میں اس قسم کی ایسی عمدہ اور حکمت آموز کتاب شاید کوئی نہ ہوگی۔ (۱۷)

۲۔ ''الانسان''

میں نے آپ کی کتاب ''الانسان'' کا بغور مطالعہ کیا ہے۔میں اس کتاب کو اردو زبان کے علمی لٹریچر میں ایک نہایت قابل قدر اضافہ سمجھتا ہوں۔اس سے پہلے ''حکمت عملی'' لکھ کر آپ نے اردو خواں لوگوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

''الانسان'' علمی اعتبار سے بہت زیادہ وقعت رکھتی ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ علمی حلقوں میں اس کتاب کا خیر مقدم کیا جائے گا۔اردو زبان میں اس مضمون پر شاید کوئی کتاب موجود نہیں۔اس اعتبار سے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ آپ نے اس میدان میں سب سے پہلے قدم رکھا۔اصطلاحات جو آپ نے وضع کی ہیں، نہایت عمدہ ہیں۔طرز تحریر دلکش ہے اور دقیق مسائل کو سلیس اور عام فہم زبان میں بیان کرنیکی قوت جو قدرت نے آپ کو عطا کی ہے،قابل داد ہے۔کاش اردو خواں لوگوں میں علمی مذاق پیدا ہوا اور بہت سے ایسے مصنفین پیدا ہوں جن کے دماغ

مسائل (مساعی؟) سے اردو زبان کی علمی لٹریچر ایسا ہی وسیع ہو جائے جیسے دنیا کی دیگر مہذب زبانوں کا ہے۔(۱۸)

حواشی

۱۔ سجاد مرزا بیگ "تسہیل البلاغت" (حیدرآباد دکن، ۱۳۳۹ھ) ص ۱۰

۲۔ مولانا فرید الدین شہید فرنگ کے فرزند۔ ۱۲۷۱ھ ۱۸۵۴ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور ۱۳۳۶ھ ۱۹۱۷ء کو انتقال کیا۔ دہلی کی مقتدر ہستی سمجھے جاتے تھے۔ سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے۔ ان کی ایک تصنف "الاستشفاع والتوسیل" مشہور ہے۔ تفصیلات کیلیے۔ مد اصابری۔ دہلی کی یادگار ہستیاں" دہلی ۱۹۷۲ء ص ۳۳۲۔۳۳۵۔

۳۔ دہلی میں تراہہ بہرام خان میں رہتے تھے۔ جنوری ۱۹۱۷ء تک حیات تھے۔ "انجمن خدام کعبہ" سے منسلک اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے خاندانی ارادت مند تھے۔۔ "نقوش" (لاہور) خطوط نمبر، جلد دوم، ۱۹۶۸ء ص ۲۱۰۔۲۱۱

۴۔ سجاد مرزا بیگ "شمع راہ" (دہلی، ۱۹۳۲ء) ص ۶۳ جنہوں نے ان کے ایک خطبے پر، جو ذکر میلاد النبی پر مبنی تھا، اصلاح بھی دی تھی۔ مشمولہ، ایضاص ۶۱۱۔

۵۔ ایضاً ص ۱۰۹۔۱۱۳۔

۶۔ ایضاص ۱۴۔۳۵

۷۔ بحوالہ ایضاً سرورق۔

۸۔ "تسہیل البلاغت، ص ۱۰

۹۔ سید منظر علی حیدرآباد کی علمی فیاضیاں (حیدرآباد ۱۳۵۵ھ) ص ۱۳۹۔

۱۰۔ سید تصدق حسین نام صدق تخلص، جائس میں پیدا ہوئے اور جوانی میں حیدرآباد چلے آئے۔ تعلیمات سے منسلک تھے۔ ۱۹۶۸ء میں انتقال کیا۔ شعر خوب کہتے تھے اور اسی وصف کی بنا پر شہزادہ معظم جاہ بہادر کے دربار سے وابستہ ہوئے

جہاں فانی اور جوش وغیرہ سے قرب رہا۔ ان کی خودنوشت، دربار دربار مذکورہ دربار سے ان کی وابستگی اور اس کے مختلف دلچسپ واقعات کو پیش کرتی۔ یہ تصنیف حیدرآباد دکن سے ۱۹۶۱ء میں اور کراچی سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔

۱۱۔ ص ۱۹۹ سے ۲۰۹

۱۲۔ سید منظر علی حیدرآبد کی علمی فیاضیاں ''ص ۱۴۱

۱۳۔ ص ۴۹

۱۴۔ ''مصنفین اردو (مطبوعہ: دہلی، ۱۹۳۹ء) کے مرتب سے زوار حسین نے انکی ایک کتاب شمع ہدایت کا حوالہ دیا ہے، لیکن اس کا ذکر اور تفصیلات کہیں اور دستیاب نہیں۔

۱۵۔ مطبوعہ: سجاد منزل، دہلی۔ سنہ اشاعت موجود نہیں۔

۱۶۔ ص ۵ ۱۷۔ ص ۹ ۱۸۔ ص ۵۱

پروانہ اور اقبال

اکبر حیدری کشمیری

ابھی کچھ دن ہوئے کہ مجھے غالب انسٹیٹوٹ نئی دہلی کا کتب خانہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں پرانے اردو رسائل کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ ان میں ماہنامہ ''پروانہ'' قابل ذکر ہے۔ رسالہ نادر و نایاب ہے اور اس کا حوالہ میری نظر سے کہیں نہیں گزرا۔ اس کا معیار اور تنقیدی نظریہ اونچا ہے۔ یہ مجدد السنہ مشرقیہ احمد حسن شوکت میرٹھی کی ادارت میں میرٹھ سے شائع ہوتا تھا۔ ایڈیٹر شوکت میرٹھی کے حالات معلوم نہیں ہو سکے۔ وہ ایک باکمال اور صائب الرائے صحافی، مسلم الثبوت شاعر، اعلیٰ پائے کے تنقید نگار اور روشن خیال مصلح تھے۔ تعلیم یافتہ اور کھلے ذہن کے مالک تھے۔ ادب سے گہری وابستگی اور فن شعر پار محاکمانہ نظر رکھتے تھے۔ سرسید کے حامیوں میں سے تھے۔ انہوں نے بیدل، ظہیر فاریابی۔ متنبی کے فارسی دواوین اور غالب کے دیوان اردو کی شرحیں لکھی تھیں۔

شوکت میرٹھی ''پروانہ'' کے علاوہ اردو کے دو ہفتہ وار اخبار ''شحنہ ہند'' اور طوطی ہند'' کے بھی ایڈیٹر اور مالک تھے۔ ''پروانہ'' کے ساتھ یہ اخبار بھی میرٹھ میں چھپتے تھے۔ سالار جنگ میوزیم حیدرآبد کے بے نظیر کتب خانہ (مطبوعات) میں اردو کے متعدد پرانے اخبار محفوظ ہیں۔ ان میں اودھ پنچ لکھنو (سال اجراء ۱۸۷۷ء) سفیر ہند (۱۸۸۰) الپنچ پٹنہ (۱۸۸۵) دکن پنچ (۱۸۸۵ء) اور ''الوقت'' گورکھپور (۱۸۹۲ء) قابل ذکر ہیں۔ یہ سبھی اخبار میری نظر سے گزرے ہیں اور کام کی چیز ہیں۔ الوقت مطبوعہ ۱۳ اگست ۱۸۹۲ء ص ۸ میں شوکت میرٹھی کا وہ تبصرہ نقل ہوا تھا جو انہوں نے اپنے اخبار شحنہ ہند بابت ۲۴ جولائی 1896ء میں شائع کیا تھا۔ تبصرے میں ان کیمعیار صحافت نگاری پر روشنی پڑتی ہے اس لیے اس کے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔

''اس کا ایڈیٹر (مولوی محمد سعید زاہد) انیسویں صدی کی ضرورتوں سے واقف اور تعلیم یافتہ ہے۔ طرز تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس نے قومی اور ملکی اغراض کو اپنی ذاتی اغراض پر ترجیح دی ہے۔ چکنے کاغذ پر نہایت عمدہ ترتیب اور اسلوب سے شائع ہوتا ہے۔ موجودہ معاملات پر بحث کرتا ہے۔ ایڈیٹوریل نوٹ، لیڈنگ آرٹیکل، مراسلات، منقولات، واقعات، قانونی امور۔ انتخاب گورنمنٹ گزٹ، اشتہارات، ٹھیک اپنے اپنے محل اور موقع پر ہیں۔ بے شک ہندوستان کو ایسے ہی اخبارات کی ضرورت ہے۔ طرز تحریر سے شائستہ اور مہذب ہے، مرنج و مرنجان پر عمل ہے۔ ہم عصرانہ نفاق تعلّی اور حسد سے پاک ہے۔۔۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا ہم عصر کامیاب ہو اور گورکھپور کے مقامی اخباروں میں کشمکش اور نفاق نہ ہو جیسا کہ عام اخباروں کا شعار ہے۔

ا۔ طوطی ہند۔

یہ اخبار نادر و نایاب ہے۔ جن لوگوں نے اردو صحافت نگاری پر کام کیا ہے، انہوں نے اپنی تصانیف میں اس کا کہیں حوالہ نہیں دیا۔ جناب عبدالسلام خورشید کی کتاب ''صحافت پاکستان و ہند میں'' بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے۔ اختر الدولہ کی کتاب میں لکھا ہے کہ

''طوطی ہند کو اردو کے مشہور و معروف شاعر سید مرتضیٰ بیان و یزدانی نے منشی ولایت علی خان مختار عام و مالک مطبع المطابع حدیقہ علوم کے اہتمام سے ۱۸۸۱ء میں جاری کیا تھا۔ اس اخبار میں برجستہ مضامین، عمدہ آرٹیکل، سودمند لیکچر، فصیح و بلیغ اسپیچ، علوم و فنون کی باتیں قومی اور ملی پرچے اور اچھی اچھی علمی بحثیں صورت رقم پاتی تھیں۔ اخبار ۲ ورق میں ہر ہفتہ ارشنبہ کو چھپتا تھا۔ گورنمنٹ اور والیان ملک سے ۵ روساء و امراء سے ۱۲ اور عام شائقین سے ۱۰ روپے سالانہ چندہ لیا جاتا تھا۔ کاتب اخبار شوکت علی۔ لوح نویس مشتاق احمد ایڈیٹر سید کرار حسین روحانی۔ اب سید سجاد

حسین صاحب ریحانی مالک اخبار اور رئیس شہر کے اہتمام سے شائع ہوتا ہے۔

اختر الدولہ نے اختر شاہنشاہی پہلی مرتبہ جون ۱۸۸۸ء میں شائع کی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ اس کے بعد یہ اخبار احمد شوکت کی ملکیت میں آیا ہو۔

۲۔ اخبار ''شحنہ ہند''

اختر الدولہ کے بیان کے مطابق یہ اخبار احمد حسن شوکت کی ادارت میں میرٹھ سے ۲۰ جنوری ۱۸۸۳ء کو اجراء ہوا تھا۔ اس کے لوازمات درج ذیل ہیں:۔

۔۔۔ دیسی زبان کی انشاء دازی کی اصلاح کرے گا اور بتائے گا کہ مہذب اور فصیح و بلند انشا پردازی کس کو کہتے ہیں۔

۔۔۔ لوکل معاملات اور سوشل امور پر آزاد مگر خیر خواہی کے ساتھ نکتہ چینی کرے گا۔ مدبرانہ و مصلحانہ و شاعرانہ و عالمانہ غرضیکہ ہر قسم کے خیالات شائع کرے گا۔

۔۔۔ مذہبی تعصب کو پاس نہ پھٹکنے دے گا۔ گورنمنٹ اور رعایا اور تمام مذاہب ہندوستان کا یکساں خیر خواہ ہوگا۔

۔۔۔ ہندوستانی ریاستوں کی اصلاح کرے گا اور بتائے گا کہ موجودہ زمانے میں کیا کرنا چاہیے۔ اقوام ہندوستان میں عموماً اہل اسلام میں خصوصاً اتفاق پیدا کرنے اور نیشنلٹی کے قائم کرنے میں ساجھی ہوگا۔

۔۔۔ دیسی اخبارات پر بالالتزام ہمیشہ ریویو لکھا کرے گا۔ جن ایڈٹری اور وقائع نگاری کے اصول بتائے گا۔ اور دیسی اخبارات جو کچھ غلطیاں کریں گے یا کر رہے ہیں۔ ان پر تنبیہہ کرے گا۔ الغرض اپنے کو اسم بامسمیٰ ثابت کر دے گا۔ انشاءاللہ گورنمنٹ اور والیان ملک سے ۲۵، روساء و امراء سے ۱۳ اور عام شائقین سے ۹ روپے۔ چار ورق اوسط۔ مالک جناب مولوی احمد حسن صاحب شوکت از مطبع المطابع۔ (۲)

شوکت میرٹھی نے میرٹھ میں ایک مشاعرہ قائم کیا تھا۔اس کا نام مشاعرہ نوچندی تھا۔

مشاعرہ ہر مہینے ہوا کرتا تھا۔اس میں جو شعراء حصہ لیتے تھے۔ان میں اکثر و بیشتر شوکت کے شاگرد ہوئے تھے۔پروانہ کے بعض شماروں میں ان کینام اس طرح درج ہیں:

پیارے لعل شاکر میرٹھی،قادر بخش شاد،سید امیر علی وا،محمد شیث جودت،محمد شفیع ناصر،امیر حسن سہانپوری۔

پروانہ۔

پروانہ،ستمبر ۱۸۹۵ء میں جاری ہوا تھا۔شمارہ بابت ماہ ستمبر جلد ۶ نمبر ۱۲،۱۹۰۶ء ص ۲۵ میں ''اختتام سال''کے تحت ذیل کی عبارت قابل غور ہے۔

''اے سر بیان و معاونان۔پرونہ مبارک ہو کہ آپ کے پرونہ نے ساتویں سالگرہ کا خلعت پہنا۔باغبان حقیقی کی آبیاری اور آپ کی عنایتوں کی باو بہاری کی مددگار سے اس نخل تجدید (پروانہ) کو جو کچھ گلکاری نصیب ہوئی۔اس کی شکر گزری سے عہدہ براری کسی طرح نہیں ہوسکتی ع۔

اے باد صبا این ہمہ آوردہ تست

اگر چہ فیض تجدید اقطار ہندوستان میں ہماری دلی آرزو اور منشا کے موافق عام دتام نہیں ہوا کیونکہ اوردو شاعری اسی پرانی تقلید کے ڈھرے پر چل رہی ہے،تام (پروانہ) نے اس شاہد عذرا کے چہرے سے نقاب اٹھا کر کسی قدر جھلک رکھادی۔رفتہ رفتہ مشاقان جمال میں جس وقدر تاب نظارہ پیدا ہوتی جائے گی۔اسی قدر انکشاف ہوتا جائے گا۔

صاحبو!قصائد خاقانی۔نکات بیدل،متنبّی وغیرہ کے حل سے مجدد(مدیر پروانہ) کو صرف اپنی شان دقیقہ سنجی دکھانا مقصود نہیں بلکہ اردو شعراء کے دماغوں میں

معلومات کا جوہر پیدا کرنا مدنظر ہے اور صیر فی نقد سخن اس امر کی بخوبی سمجھتے ہیں نہ کہ عام شعراء۔ یہی وجہ ہے کہ "پروانہ" ع۔

اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی

کا مصداق بنا ہوا ہے، مگر وہ اپنی رفتار ترک نہیں کر سکتا۔ بڑے بڑے علماء اور فضلاء اور بالغ نظر شعرا اس شان تجدید سے واقف ہو گئے ہیں، مگر افسوس ہے کہ بعض وجود سے اکتساب فیض سے جھجکتے ہیں۔ ہاں، جن منصف مزاج حضرات کا کانشنس، صاف ہے، وہ فیض یاب ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

صاحبو! "پروانہ" پر یہ سال اچھا نہیں گزرا۔ کچھ ہماری علالت سے اور کچھ معاونوں اور مربیوں کی بے پروائی سے۔ امید ہے کہ آئندہ نعم البدل ہوگا اور "پروانہ" کے مربیوں میں سیلف ہیلپ کا جوش پیدا ہوگا۔

پروانہ سے پہلے اور اس کے بعد جن رسالوں کا اجراء ہوا تھا، اور جو ہماری نظر سے گزرتے ہیں۔ ان میں سے ذیل کے پرچے قابل غور ہیں:۔

۱۔ مخزن الفواید۔ حیدر آباد سال اجراء ربیع الثانی ۱۲۹۱ھ ۱۸۷۴ء ایڈیٹر نواب عماد الملک عماد الملک سید حسین بلگرامی۔

۲۔ دلگداز۔ لکھنو سال اجراء جنوری ۱۸۸۷ء ایڈیٹر شرر لکھنوی۔

۳۔ حسن۔ حیدر آباد سال اجراء ۱۸۸۷ء ایڈیٹر نواب عماد نواز جنگ تخلص حسن۔

۴۔ مرقع عالم۔ ہردوئی سال اجراء ۱۸۹۰ء ایڈیٹر حکیم محمد علی خان

۵۔ ادیب۔ فیروز آباد سال اجراء ۱۸۹۶ء ایڈیٹر سید اکبر علی۔

۶۔ خدنگ نظر۔ لکھنو سال اجراء ستمبر ۱۸۹۷ء ایڈیٹر نوبت رائے نظر۔

۷۔ اردوئے معلےٰ۔ دہلی سال اجراء نومبر ۱۸۹۷ء ایڈیٹر احمد شفیع نیر۔ مرقع عالم پریس ہردوئی۔

۸۔ مخزن ۔لاہور سال اجراء اپریل ۱۹۰۱ء ایڈیٹر شیخ عبدالقادر

''پروانہ'' متنوع مضامین اور متانت وسنجیدگی کے اعتبار سے متذکرہ بالا رسالوں کی ٹکر کا تاھ۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ تنقیدی نظریات، سخن فہمی۔ لہجے کی گرمیک اور اصلاحی شعور میں اسے سب پرچوں پر فوقیت حاصل تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ اتنا اہم اور سنجیدہ پرچہ گوشہ گمنامی میں پڑا رہا۔ یہ ہر ماہ پابندی کے ساتھ نکلتا تھا۔ اس کے قواعد وضوابط دیگر رسالوں کے مقابلے میں قدرے سخت تھے۔ ہر شمارے کے دوسرے صفحے پر ''ضوابط پروانہ'' یوں درج رہتے تھے۔

''ہر انگریزی مہینے میں ۳۲ صفحات کے حجم سے لے کر ۴۲ صفحات تک شائع ہوتا ہے۔ ایشیائی شاعری کی اصلاح کا پہلا فرض ہے۔ قیمت سالانہ پیشگی ۔والیان ملک سے عمائد و رؤسا سے طلبہ اور کم استطاعت والوں سے مابعد کا حساب نہیں۔ دینے والے با ۱۲ خریداروں کی پیشگی قیمت بھجوانے والے ''پروانہ'' کے مربی ہوں گے۔ اور سالانہ دینے والے معاون ششماہی پیشگی۔ نمونہ کے پرچے کی قیمت ۵ ہیں کیونکہ پروانہ فی حد ذات ایک مستقل کتاب ہے اور یہ عام قاعدہ ہے کہ کوئی کتاب نمونہ میں مفت نہیں بھیجی جاتی۔

اعلیٰ درجے کی ایشیائی نظم خواہ سوشل ہو پولیٹکل مشکوری کے ساتھ طبع ہوگی۔ بلکہ حسب تجویز کمیٹی ''پروانہ'' انعام بھی اعلیٰ قدر مراتب دیا جائے گا۔ اس سے یہ مقصد ہے کہ نئی روشنی والے جو ایشیائی شاعری کے سائنس سے ناواقف ہیں اور اس وجہ سے اس کو حقیر سمجھتے ہیں، ان انکی راہ مین ایسی مشعل توفیق رکھی جائے کہ انیسویں صدی جس کو اپنی ہر قسم کی ترقی پر ناز ہے۔ ایشیائی شاعری کا نمونہ دکھائے تو سہی۔

''پروانہ'' عام رسالوں کی مانند نہیں۔ جس میں ہر کس وناکس کا رطب ویابس کلام شائع ہو جائے بلکہ اعلیٰ درجے کا مضبوط اور مربوط ٹھوس کلام ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہم خود غرضی مدنظر نہیں بلکہ ہمارا مقصد ایشیائی شاعری کو فروغ دینا ہے جس کا

ستارہ ملک اور قوم کی ناعاقبت اندیشی یا جہالت سے آج ڈوب گیا ہے۔پس ''پر
وانہ''میں انہی حضرات کی غزلیں شائع ہوتی ہیں جو پیشگی قیمت بھیج دیتے ہیں۔غیر
طرح کلام صرف مربیوں اور معاونوں کا شائع ہوگا۔اوروں کا نہیں۔

اعلان عام۔

''پروانہ'' سے جو لوگ فیض اٹھانا چاہتے ہیں۔اگر وہ اپنا کلام بھیج کر خواہش
کریں گے اور جس رنگ اور جس مرتبہ کا کلام ہوگا۔اس میں انشاءاللہ ویسی ہی فصیح و
بلیغ اصلاح دی جائیگی۔کیونکہ ''پروانہ''ایشیائی شاعری کا مجدد اور رفامر ہے اور کسی
شخص کو اپنا نقص آپ نہیں معلوم ہوتا۔اس کو مجدد ہی خوب جانتا ہے، کہ فلاں کلام
کس پایہ کا ہے اور اس میں کیا خوبی اور کیا نقص ہے اور یہ دعویٰ سرسری ہی نہیں بلکہ
مع البرہان ہے۔جو صاحب چاہیں دیکھ لیں۔پرکھ لیں،پرکھالیں۔

(مجدد السنہ مشرقیہ ابوادریس احمد شوکت مدیر ''پروانہ''و شحنہ ہند'میرٹھ'')

''پروانہ'' ۲۳X۱۵ سینٹی میٹر کے سائز میں ۲۵ سطر فی صفحہ چکنے کاغذ اور عمدہ
کتابت میں ایڈیٹر کے ذاتی پریس ''شوکت المطابع''میرٹھ سے چھپتا تھا اور اس کے
پڑھنے والے ہندوستان کے طول وعرض میں تھے۔سری نگر، کشمیر میں بھی جایا کرتا
تھا۔اس میں اور لوگوں کے علاوہ ڈاکٹر اقبال، ڈاکٹر نذیر احمد۔مہاراجہ کشن پرشاد،
سید محمود، پیارے لعل شاکر، سید امجد علی اشہری اور مدیر مجدد السنہ مشرقیہ احمد حسن شوکت
کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔یہ نہیں دریافت ہوسکا کہ ''پروانہ کب تک جاری رہا۔''
غالب انسٹیٹیوٹ'' دہلی میں تقریبا ایک سال کے شمارے ہیں۔ان میں سے بعض کی
تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

''پروانہ'' ماہ جنوری وفروری ۱۹۰۲ء جلد ۶ نمبر ۴، ۵

ص ۱ اور ص ۲ سرورق اور ضوابط ''پروانہ''۔ص ۳ اور ص ۴ میں سید امجد علی اشہری
(متوفی ۱۹۱۰ء) کی دو نظمیں ''خوشامد'' اور ''زیور'' کے عنوان سے ہیں۔دونوں کے

مطلع بالترتیب درج کیے جاتے ہیں

۱۔ خوشامد بھی عجب تاثیر میں اپنی ہے لاثانی
ہزاروں رنگ کی موجد ہزاروں طرح کی بانی

(۳۵ شعر)

۲۔ ایک لڑکی نے یہ پوچھا اپنی ماں جان سے
آپ زیور کی کریں تعریف مجھ نادان سے

(۱۱ شعر)

ص ۵ اور ص ۶۔ مخمس بر قصیدہ امام ہمام حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ ازمولوی حکیم حافظ احمد ایمن سکندر پوری (۱۱ بند)۔ مخمس کے آخر میں ایڈیٹر صاحب کا یہ نوٹ قابل ذکر ہے:

''یہ قصیدہ یقیناً حضرت امام زین العابدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نہیں۔ اس میں جابجا اسقام ہیں اور ایک بے ربط کلام ہے۔ جیسا کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا دیوان اور جیسا کہ ظہیر فاریابی کا دیوان جو مطبع نولکشور میں چھپے ہیں۔ ایسا لچر کلام نہ خواجہ صاحب کا ہو سکتا ہے۔ نہ ظہیر فاربی کا۔ لوگوں نے ٹکے سیدھے کرنے کی جانب سے گھڑ ادیا۔ ہندوستان کے اہل مطابع میں چشم بصیرت کہاں کہ کھرے اور کھوٹے کو پرکھیں۔

ص ۷ اور ص ۸ میں سید محمود کی ایک نظم ۳۷ اشعار میں ہے۔ اس کا عنوان ''حالت قوم'' ہے۔ ص ۹ ص ۱۴ میں فارسی اور اردو غزلیں ہیں۔ ص ۱۳ میں ''مسٹر پیارے لعل صاحب شاکر میرٹھی شاگرد مجدد الوقت (احمد حسن شوکت) ازشادی وال ضلع گجرات کی ایک غزل ہے۔ چند شعر یہ ہیں۔

کیا زباں سے ہو بیاں شان جناب شوکت
سب زباں داں ہیں ثنا خواں جناب شوکت

اٹھ سکے کس سے یہ احسان جناب شوکت
ہند میں جاری ہے فیضان جناب شوکت

عند لیبان خیالات ہیں سب نغمہ سرا
ہے پھلا پھولا گلستان جناب شوکت

اپنے ارمان تو نکلیں گے جبھی اے شاکر
جلد چھپ جائے جو دیوان جنا ب شوکت

ص ۱۶ تا ص ۲۴ مرقع حل کلام شعراء نکات بیدل۔ ان صفحوں میں بیدل عظیم آبادی کے مشکل اشعار کی آسان شرح لکھی گئی ہے۔ ص ۲۴ اور ۲۵ میں ۵۴ شعر کی ایک نظم بعنوان ''صنعت اور ناتوانی'' درج ہے۔ شاعر کا نام نہیں لکھا گیا۔ ص ۲۶ کے آخر غزلوں کا اعلان کیا گیا ہے:

مارچ ع۔ سیمیں تنوں پہ خاک چلے مفلسی کا زور
اپریل ع۔ اک علی ہے وہ بھی مرجھائی ہوئی
مئی ع۔ اک کلی ہے وہ بھی مرجھائی ہوئی
مئی ع ۔ شیشہ جب صہبا کا ٹوٹا صورت ساغر ہوا۔

اس کے بعد ''اعلان'' کے تحت ذیل کی عبارت ہے:

''مندرجہ بالا دوطرح اس لیے خلاف قاعدہ بے ترتیب ردیف ہیں کہ یہی دونوں طرحیں بجوم نوچندی میرٹھ کے مشاعرے کے لیے تجویز کی گئی ہیں جو سالانہ

مجد دالوقت کے خیمہ گاہ پر ہوتا ہے اوراب کی شروع اپریل ۱۹۰۲ء میں ہوگا۔ اگر کوئی صاحب آخر مارچ تک غزلیں بھیجیں گے۔ پڑھوا دی جائیں گی۔ اور فارسی کی طرح بابت مشاعرہ یہ ہوئی ع۔

بکف داماں اور ناید مگر دست گریباں را''

''پروانہ''۔ ماہ مارچ ۱۹۰۲ جلد ۲ نمبر ۲

اللہ اللہ کیا غضب ہے انقلاب روزگار

یعنی وہ اسلام جو تھا منبع عز و وقار

وا دریغا! اب وہی اسلام ہے جس کے خواص

ہیں عوام الناس کی نظروں میں بے تو قیر و خوار

یا ہمارے نیک و بد میں ہم کو مدخل کچھ نہیں

جو ہوا جو ہو گا۔ سب کا ہے مقدر پر مدار

بس یہ دو باتیں ہیں جن کو سید احمد صاف صاف

خلوت و جلوت میں در پردہ بظاہر آشکار

جب تلک جیتا رہا ، کہتا رہا ، اک ایک سے

ایک سر پر قوم کے جن تھا جہالت کا سوار

کفر کے فتوے لکھے جانے لگے بالا تفاق

دھمکیوں اور گالیوں کا ہو گیا مشکل شمار

وقعتہ اسلامیوں میں کھلبلی سی مچ گئی

آگ سی اک لگ گئی پنجاب سے لے تا بہار

دیکھ کر سید پہ اعدا کا باین کثرت ہجوم
پھر گئی آنکھوں میں ایسی کربلا کی کار زار

آخری دم تک وہ اپنی بات پر قائم رہا
تھی وقر اس کی سرشت اور عہد اس کا استوار

اس نے ثابت کو دکھایا روز روشن کی طرح
یہ کہ اب تعلیم پر بہبود کا ہے انحصار

علم دولت ، علم حشمت، علم طاقت ، علم زور
علم لشکر ، علم خنجر ، علم تیغ آب دار

علم ہے فوز و فلاح دین و دنیا کا کفیل
علم ہے تہذیب اور شائستگی کا ذمہ دار
علم ہی ہے عقل آئینہ فہم و ذکاء
علم ہی ہے گلشن قبال مندی کی بہار

ہائے وہ سارے مسلمانوں کا سچا خیر خواہ
ہائے وہ پیارے مسلمانوں کا پکا دوستدار

پھر علی گڑھ میں کہ ہے ہندوستاں کو جس سے فخر
پا چکا ہے نام جس کا ملکوں ملکوں اشتہار

بہہ رہا ہے علم کا دریا بہ از شیر و عسل
آب ، آب زندگی شیرین و صاف و خوشگوار

گر مسلمانو تمہیں دنیا میں رہنا ہے بخیر
پس اسی تعلیم کو فی الفور کر تو اختیار

یہ وہی تعلیم ہے جو جو مقتضائے وقت ہے
کون روکے وقت کو رستم ہو یا اسفند یار

علم کا کعبہ ہے اس میں گھومات پھرتا طواف
دوڑن ہے سعی اور فٹ بال ہے رمی الجمار
جامہ احرام ہے نکٹائی اور پتلون ہے
سر برہنہ مثل محرم گر نہیں فر کی بہار

''پروانہ'' بابت ماہ مئی ۱۹۰۲ء نمبر ۸ جلد ۲

کسی لکھنوی شاعر نے داغ دہلوی کے کلام پر اعتراض کیا تھا۔ ایڈیٹر ''پروانہ'' نے اس کو للکارا کہ اس کی کیا مجال ہے کہ وہ داغ پر اعتراض کر سکے:

''خبردار! آئندہ چونچ کھلی تو ہم سے برا کوئی نہیں۔''

ایڈیٹر صاحب جب چاہتے ہیں داغ کا دفاع کرتے ہیں اور جب چاہتے ہیں خود ان کو تختۂ مشق بناتے ہیں۔ داغ کی حمایت میں ''پروانہ'' ص ۳ کا عکس مضمون

کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔اس کا عنوان ہے۔ ''حضرت داغ پر اعتراض۔

ص ۴ ت ص ۶ میں جلیک مانک پوری کی مشہور غزل پر ''ریویو'' کے تحت سخت الفاظ میں تنقید کی گئی ہے۔ یہ غزل حیدر آباد کے مشاعرے میں پڑھی گئی تھی۔ ایڈیٹر صاحب تمہید میں لکھتے ہیں۔

''حضرت جلیل کے کلام پر ہم پہلے بھی ریویو کر چکے ہیں اردو کے معمولی شاعر ہیں اور وہ بھی صرف غزل میں۔ حضرت امیر (امیر مینائی) کے کلام میں جو شگفتگی ہے، وہ ان کو چھو بھی نہیں گئی۔ ہمارے خیال میں حضرت امیر کی جانشینی کے قابل اگر کوئی ہے تو ریاض ہے۔ ان کا کلام شوخی۔ معاملہ، مذاق، رندی الغرض ہر پہلو کے لئے ہوئے ہے۔اور با ایں ہمہ اور شگفتہ ہے۔''

جلیل:

جو سن ہے کم تو وہ کچھ واقف عتاب نہیں
دم سحر ہے ابھی گرم آفتاب نہیں

ایڈیٹر: مصرعہ اولی بہت کاوش اور فکر میں لکھا گیا ہے۔یعنی پہلے کچھ اور لکھا پھر بدلا۔تاہم الجھن نہ گئی۔ یوں فرمایئے ع ''وہ کم سنی کے سبب واقف عتاب نہیں

جلیل:

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

ایڈیٹر: واہ جناب واہ۔ خلاف سنت شعرائے۔ نگاہ اور چہروں دنوں کو زمین دوز کر دیا۔ ترقی اور تفضیل کی پہیلی کا بھی اتا پتا نہیں۔ پھر کیا برق اور آفتاب کے دیکھنے کی کسی کو تاب ہے؟ شاید اسے ہو جو تاب لا کر آنکھیں مانگتا پھرے۔ اصلاح ملاحظہ ہو۔

نگہ جو برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں

وہ آدمی ہے تو کیوں دیکھنے کی تاب نہیں

جلیل:

زباں کو سوز جگر کہنے میں حجاب نہیں
ہماری شمع پہ گھونگھٹ نہیں، نقاب نہیں

ایڈیٹر: بالکل ٹکسال باہر ہے۔ کہنے کی یاء مجہول دبتی ہے۔ پھر مطلب بظاہر یہ ہے کہ اگر زبان کو سوز جگر کہیں تو اس میں کچھ حجاب نہیں،۔ حالانکہ یہ آپ کا مطلب نہیں۔ پھو گھونگھٹ اور نقاب دونوں میں ایک حشو ہے۔ اصلاح ملاحظہ ہو۔

زباں بیاں جو کرے سوز دل، حجاب نہیں
یہ شمع وہ ہے جسے حاجت نقا ب نہیں

جلیل: ہر ایک آنکھ میں شکل ان کی ہے سمائی ہوئی
بہت سے پردے ہیں کچھ ایک ہی نقاب نہیں

ایڈیٹر: مصرعہ اولی کی بندش کتنی لچر ہے۔ ان کی کا تقطیع میں پھر کونا دبتا ہے اور مضمون بھی مہمل، کیونکہ جب ہر آنکھ میں ان کی شکل سمائی ہوئی ہے تو پردہ کہاں رہا۔ اگر آنکھ کے پردے مقصود ہیں تو شعر یوں ہونا چاہیے۔

ہر ایک آنکھ میں صورت تری سمائی ہے
بہت ہیں پردے مگر ایک بھی نقاب نہیں

شوکت میرٹھی نے جلیل کی غزل کے ۱۵ اشعر درج کیے ہیں۔ ہم نے بہ سبب طوالت صرف ۴ شعر پیش کیے ہیں۔ جو شعر ایڈیٹر صاحب کو اچھا لگا تھا۔ اس کی انھوں نے تعریف کی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے۔

بتوں سے پردہ اٹھانے کی بحث کیا کرتے
کھلی **دلیل** ہے کعبہ بھی بے نقاب نہیں

''پروانہ'' بابت ماہ جون ۱۹۰۲ء نمبر ۹ جلد ۶

اس شمارے کی خاص بات ہے کہ ایڈیٹر صاحب نے مرزا داغ دہلوی کو اپنی تنقید کا نشانہ نہ بنا دیا۔ ص ۱۰ سے ص ۱۲ تک داغ کے دیوان ''گلزار داغ'' کی پہلی غزل پر ریویو کیا۔ ذیل میں چند شعروں کی تنقید پیش کی جاتی ہے۔

''داغ: عدوئے سامری فن دیکھے اعجاز رقم میرا
عصائے موسوی ہے حمد خالق میں قلم میرا

ایڈیٹر: کیوں جناب یہ ''عدوئے'' میں ''یے'' کیسی ہے۔ لفظ تو عدو ہے۔ پھر ''دیکھیے'' کی تقطیع میں لیے گرتی ہے جو آپ جیسے مشتاق کہنہ شاعر کے پان کو شعراء کی بھری محفل میں سرخرو نہیں کر سکتی۔ کوئی نو آموز کہہ سکتا ہے۔ کہ ''یے'' نہیں بلکہ ''اعجاز'' کا الف جو اڑا گرتا ہے۔ پھر دوسرے میں 'عصائے موسوی'' صحیح ہے یا عصا ءموسیٰ۔ صحیح مذاق سے فرمائیے کہ 'علیل' سے اصلاح ملاحظہ ہو۔

عدو سامری فن دیکھ اعجاز رقم میرا
کہ ہے ثعبان موسیٰ حمد خالق میں قلم میرا۔

داغ: برنگ بوئے گل ہے ہر نفس یاد الٰہی میں
قیامت تک بھرے گی دم نسیم صبحدم میرا

ایڈیٹر: ماشاءاللہ خوب شعر ہے۔ مگر ایک آنچ کی کسر ہے۔ یاد الٰہی میں آپ کی ہر سانس ہے۔ مگر نسیم صبحدم خود آپ کا دم بھرے گی۔ بلاغت کی یہ شان نہیں۔ خدا کرے آپ یہ نکتہ سمجھیں۔ مصرعہ اولی یوں بنا لیجئے ع۔

برنگ بوئے گل ہوں ہر نفس یاد الٰہی میں

دیکھئے اب دونوں مصرعوں میں مطابقت ہوگئی۔ یعنی میں خود ہر دم یاد الٰہی میں مصروف ہوں تو نسیم صبحدم کیوں میرا دم نہ بھرے ورنہ جب سانس مصروف زکر اللہ ہے تو نسیم سانس ہی کا دم بھرے گی نہ کہ آپ کا۔ آپ نتھنے پھولا کر دم اور نسیم صبحدم کو کیوں ہوا بتاتے ہیں۔

داغ۔ الٰہی نقش ہو کلمہ رسول اللہ کا دل پر

چلے کونین میں نام محمد ﷺ سے درم میرا

ایڈیٹر درم کیواسطے سکہ کی ضرورت ہے۔ پھر نام محمد اور کلمہ رسول اللہ دونوں ایک ہیں۔ دوسرا مصرعہ یوں بنا لیجئے۔ ع۔

یہ سکہ ہے چلے کونین میں اس سے درم میرا۔

غزل پر تنقید کرنے کے بعد ایڈیٹر نے اسی زمین میں اپنی غزل کے ۱۱ شعر درج کیے ہیں۔

ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ

''یہ نہ سمجھیے کہ مجدد (ایڈیٹر) اصلاح ہی کرتا ہے۔ ذیل میں تازہ بتازہ ڈال کے نوٹے اشعار بھی اسی زمین میں ملاحظہ فرمائیے۔

یہاں ہم دو شعر نقل کرتے ہیں۔

''مطلع: گزر جب سے ہوا ہے جانب کوئے صنم میرا

قدم لیتا ہے رہ رہ کر ہر اک نقش قدم میرا

''مقطع: یہ کشتیوں کے گلے پر رک کے کیوں چلتی ہے اے شوکت

زبان تیغ کھینچوں گا اگر باقی ہے دم مرا۔

''پروانہ'' بابت ماہ جولائی ۱۹۰۲ء نمبر ۱۰ جلد ۶ ص ۲۳

''ارمغان'' شاہجہان پور

''کچھ عرصہ ہوا یہ رسالہ زیر اہتمام ابو الاعجاز منشی محمد احسن علی خان صاحب احسن جاری ہوا تھا مگر مفت خوروں اور نادہندوں کی بدولت جن کی ہندوستان میں کمی نہیں بند ہو گیا تھا۔ چنانچہ منشی صاحب کو انھیں ظالموں، ٹائنوں، ناخدا ترسوں کی بدولت پانسو روپیہ کا نقصان اٹھانا پڑا۔ مگر منشی صاحب کی عالی ہمتی قابل تحسین ہے کہ اب پھر جاری کیا۔ حضرت احسان کا کلام سلجھا ہوا اور بہت صاف ہوتا ہے۔ طبع رسا اور

ذہین سلیم رکھتے ہیں صاحب تصانیف ہیں۔ مشاق ہیں۔ باخبر ہیں امید ہے کہ رسالہ ترقی کرے گا بشرطیکہ ''ارمغان'' کے تمام ناظرین اردو شاعری کے ہمدرد اور با حیا ہوں۔ قیمت سالانہ ۴۔

''پروانہ'' بابت ماہ ستمبر ۱۹۰۲ء نمبر ۱۲ جلد ۶

اس شمارے میں ص ۲۰ اور ۲۱ میں ایڈیٹر صاحب نے پھر اپنے تنقیدی مزاج کا مظاہرہ ''ریویو'' پر ریویو لکھ کر کیا ہے۔ اس میں انہوں نے ''اودھ پنچ'' لکھنو کے لکھنے والوں کو مورد الزام ٹھہرایا کہ وہ کلام داغ پر بے جا اعتراضات کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ

''ہم لکھ چکے ہیں کہ داغ جیسے پرانے شاعر ماہر استاد شاہ دکن کے کلام پر قلم اصلاح اٹھانا صرف مجدد (ایڈیٹر) کا کام ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں پنچوں کو تو دل لگی سے غرض ہے۔ وہ کیں چوکنے لگے۔

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے انہیں
ورنہ واں بے رونقی دود چراغ کشتہ ہے

''اودھ پنچ'' کے نامہ نگار اور تو اور سہو کتابت کو بھی غریب داغ ہی کے سر منڈھتے ہیں''

اس کے بعد ایڈیٹر صاحب نے داغ کے ۵ شعروں کو حق بجانب قرار دے کر داغ کا دفاع کیا۔

ص ۲۱ سے ۲۵ تک اقبل کی ایک طویل نظم طبعزاد شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے کے تحت درج ہے۔ کسی ماہر اقبالیات نے اس نظم کی اشاعت کے سلسلے میں پروانہ کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ یہ اس کی نایابی کی بڑی دلیل ہے۔ مجھے اس نظم کی برسوں سے تلاش تھی۔ مثل ہے کہ جوئندہ یابندہ۔ اس نظم کے ملنے سے مجھے بے انتہا خوشی ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ میں نے مضمون کا نام ''پروانہ'' اور اقبال'' قرار دیا۔

پروفیسر گیان چند جین نے اپنی کتاب ابتدائی کلام اقبال ۔ بہ ترتیب مہ و سال کے صفحہ ۱۵۹ میں اس نظم کو عبدالغفار شکیل کی کتاب ''نوادر اقبال'' ص ۱۳۸ کے حوالے سے شامل کیا ہے۔

موصوف لکھتے ہیں کہ

''اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سترہویں سالانہ اجلاس میں ۲۳ فروری ۱۹۰۲ بروز اتوار دوسرے اجلاس میں یہ نظم پڑھی ۔ جلسے کی صدارت میاں نظام الدین سب جج راولپنڈی نے کی۔ جلسہ اسلامیہ کالج میں منعقد ہوا۔ نظم کے اختتام پر صدر نے کہا۔

''شیخ صاحب کی تعریف جس قدر کی جائے، کم ہے ۔ آپ پنجاب کے ملک الشعراء ہیں۔

اس نظم سے سامعین اس قدر متاثر ہوئے کہ اس کی کاپیاں دس دس روپیہ میں خرید لیں۔

جین صاحب مزید یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے۔ کہ اس نظم کا عنوان ''زبان حال'' ہی تھا۔ وحید کی ''کتابیات'' میں ذیل کا اندراج ہے۔

''زبان حال ۔ پنجہ فولاد ۱۹ مارچ ۱۹۰۲ء جلد ۲ ص ۱۱۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے ساتویں سالانہ جلسے میں ۲۳ فروری ۱۹۰۲ء کو (ص ۳۸۱)

یہ نظم ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں کو کے عنوان سے اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور میں پڑھی تھی ۔ خدا جانے کہ یہ نظم ''مخزن'' لاہور میں کیوں نہیں زیور طبع سے آراستہ ہو سکی ۔ ذیل میں ہم اس نظم کا متن پیش کرتے ہیں۔ اس میں اور دوسرے متون میں جو اختلاف ہے۔ اس کی نشان دہی حواشی میں کرتے ہیں ۔ حواشی میں ''ج'' سے مراد پروفیسر گیان چند جین کی کتاب ''ابتدائی کلام اقبال بہ ترتیب مہ و سال ہے۔

طبع زاد شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے

ہم سخن ہونے کو ہے معمار سے تعمیر آج
آئے کو ہے سکندر سے سر تقریر آج

نقش نے نقاش کو اپنا مخاطب کر لیا
شوخیء (۳) تحریر سے ، گویا ہوئی تصویر آج

سن کے کیا کہتی ہے دیکھیں باد عنبر بار صبح
لب کشا ہونے کو ہے اک غنچہ و لگیر آج

دیکھیے گل کس طرح کہتا ہے احوال خزاں
مانگ کر لایا ہے بلبل سے لب تقریر آج

عشق ہر صورت سے ہے آمادہ تزئین حسن
ہے پر پروانہ سے کار لب گلگیر آج

گرمی (۴) صیاد کی آتش گزاری دیکھنا
شمع کے اشکوں میں ہے لپٹی ہوئی تنویر آج

آہ میں یا رب یہ (۵) کیا اندا زمعشوقانہ تھا
جوش لذت میں فدا ہو ہو گئی تاثیر آج

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

عقدے کھل جانے کو ہیں مشل وہاں روزہ دار
ہے ہلال عید اپنا ناخن تدبیر آج

دیکھئے باس سحر کا ہوتا ہے کس کس پر اثر
ہے دخان شمع محفل سرمہ تسخیر آج

زینت محفل ہیں فرہادان شیریں عطا
اس محل میں ہے رواں ہونے کو جوئے شیر آج

صبر (۶) را از منزل دل پا بجولاں کردہ ام
گیسوئے مقصود را آخر پریشاں کردہ ام ؎

آج ہم حال دل درد آشنا کہنے کو ہیں
اس بھری محفل میں اپنا ماجرا کہنے کو ہیں

ہر نفس پیچیدہ ہے مانند دود شمع طور
داستان دلکش مہر وفا کہنے کو ہیں

دیکھئے محفل میں تڑپاتا ہے کس کو (۷) کس کو یہ شور
مرثیہ دلکش مہر و وفا کہنے کو ہیں

بوئے گل لپٹی ہوئی ہو غنچہ منقار میں
ورنہ مرغان چمن رنگیں نوا کہنے کو ہیں

تجھ کو اے شوق جراحت دیں تسلیل کس طرح
آہ ! یہ تیر نظر بھی بے خطا کہنے کو ہیں

قصہ مطلب طویل و دفتر تقریر تنگ
خود بخود کوئی سمجھ جائیکہ کیا کہنے کو ہیں

محفل عشرت میں ہے کیا جانے کس کا انتظار
آج ہر آہٹ کو ہم آواز پا کہنے کو ہیں

ہے سوئے منزل رواں ہونے کو اپنا کارواں
ہم صریر خامہ کو بانگ درا کہنے کو ہیں

ہے گہر باری پہ مائل تو جو اے دست کرم
ہم تجھے ابر سخا ، بحر عطا کہنے کو ہیں

خود بخود منہ سے نکل جانا بھی اچھا ہے مگر
دم تو لے آخر تجھے اے مدعا کہنے کو ہیں

باز اعجاز مسیحا را ہویدا کردہ ام
پیکرے را بازبان خامہ گویا کردہ ام

ابر بن کر تم جو اس گلشن (۸) پہ گوہر بار ہو
بخت سبزے کا مثال دیدہ بیدار ہو۔

میں صدف، تم ابر نیساں، میں گلستاں، تم بہار
مزرع نو خیز میں تم ابر دریا بار ہو

میں نتیجہ اک حدیث امی یثرب کا ہوں
تم اسی امی کی امت کے علم بردار ہو

اک مہ نو آسمان علم و حکمت پر ہوں میں
تم بھی اک فوج ہلالی کے سپہ سالار ہو

نام لیوا اک دیار علم و حکمت کا ہوں میں
اور تم اگلے زمانوں کے وہی انصار ہو

یاں کبھی باد خزاں کا رنگ جم سکتا نہیں
میں مسلمانوں کا گلشن، تم مری دیوار ہو
تم اگر چاہو تو اس گلشن کے ایسے بھاگ ہوں
ہر کلی گل ہو کے اس کی زینت دستار ہو

رہنے والے انتخاب ہفت کشور کے ہو تم
کیوں نہ اس گلشن کی نکہت روکش تا تا ر ہو

میری دیواروں کو چھو جائے جو اکسیر عطا
خاک بھی میری مثال گوہر شہوار ہو

دیکھ اے ذوق خریداری ، یہ موقع ہے، کہیں
حسن یوسف سے نہ خالی مصر کا بازار ہو

یوسف ایں علم من و پنجاب کنعان من است (۹)
از طلوع صبح حکمت چاک و امان من است

مجھ میں وہ جادو کہ روتوں کو ہنسا سکتا ہوں میں (۱۰)
قوم کے بگڑے ہوؤں کو پھر بنا سکتا ہوں میں

عید ہوں میں اے نگاہ چشم نظارہ تری
شاہد مقصود کا پردہ اٹھا سکتا ہوں میں
طیر حکمت باغ دنیا میں‌ہوں اے صیاد میں
دام تو سونے کا بنوائے (۱۱) تو آ سکتا ہوں میں

طوسی و رازی (۱۲) و سینا (۱۴) وظہیر (۱۵) والغزل (۱۶)
آہ وہ دلکش مرقع پھر دکھا سکتا ہوں میں

آئیں اڑ اڑ کر پتنگے مصر و روم و شام سے
شمع اک پنجاب میں ایسی جلا سکتا ہوں میں

آزما کر تم ذرا دیکھو مرے اعجاز کو
ڈھونڈھتی (۱۷) ہیں جس کو آنکھیں وہ دکھا سکتا ہوں میں

گوش بر آواز تھا مغرب کبھی جس کے لیے
وہ صدا پھر اس زمانے کو سنا سکتا ہوں میں

ناز تھا جس پر کبھی غرناطہ و بغداد کو
پھر وہی محفل زمانے کو دکھا سکتا ہوں میں

گھر کسی کا جن کی ضو سے غیرت مشرق بنے
اس انوکھی شان کے موتی لٹا سکتا ہوں میں

کارواں سمجھے اگر خضر رہ عزت (۱۸) مجھے
منزل مقصود کا رستہ دکھا سکتا ہوں میں

از خم حکمت بروں کردم شراب ناب را
ہاں مبارک سر زمین خطہ پنجاب را

بن گیا ہے دست سائل دامن گلزار کیا
باغ پر چھایا ہوا ہے، ابر گوہر بار کیا

کچھ ہو ا ایسی چلے یا رب کہ گلشن خیز ہوں
خار کیا گل کی کلی کیا غنچہ منقار کیا

حسن خود منت کش چشم تماشائی ہوا
اب نہیں دنیا میں باقی طالب دیدا ر کیا

اک جہاں آیا ہے گلگشت چمن کے واسطے
باغباں باہر نہ پھینکے گا چمن کے خار کیا

زندگی اپنی زماے میں تمہارے دم سے ہے

ہے خط دست کرم میرے نجس کا تار کیا

جس (۱۹) نے جا چھوتا ہو دامان ثریا کو کبھی
ایک دو اینٹوں سے اٹھ سکتی ہے وہ دیوار کیا

تیغ کے بھی دن کبھی تھے ، اب قلم کا دور ہے
بن گئی کشور کشا یہ کاٹھ کی تلوار کیا ۔

خوبی قسمت ہے پہنچا علم کا یوسف یہاں
ورنہ کیا پنجا ب اور پنجاب کا بازار کاے

مجھ سے وابستہ نہیں کیا آبرو پنجاب کی
تیر کی صورت نہیں ہیں طعنہ اغیار کیا

آرزوئے دل کا بھی کہنا کوئی دشوار ہے
کام خاموشی سے تجھ کو طالب اظہار کیا (۲۰)

گوش را جو یائے آواز غریباں کردہ
شانہ را مائل بہ گیسوئے پریشاں کردہ

کیوں نہ دیوانے ہوں لب سوز نہاں کے واسطے
ڈھونڈ کر محفل نکالی داستاں کے واسطے

اس بھری محفل میں اپنا راز دل کہتا ہوں میں
باغ ہی زیبا ہے بلبل کی فغاں کے واسطے

طعنہ زن ہے ضبط اور لذت بڑی افشا میں ہے
ہے کوئی مشکل سی مشکل راز داں کے واسطے

جس نے پایا (۲۱)اپنی محنت سے زمانے میں فروغ
ہے وہی اختر جبین کہکشاں کے واسطے

باغباں کا ڈر کہیں، خطرہ کہیں صیاد کا
مشکلیں ہوتی ہیں سو اک آشیاں کے واسطے

خضر ہمت کا رفیق راہ منزل ہو اگر
گلستاں تیرے لئے تو گلستاں کے واسطے
زندگی وہ چاہیے دنیا کی زینت جس سے ہو
شمع روشن بن کر رہ بزم جہاں کے واسطے

تشنہ لب کے پاس جاتا ہے کبھی اٹھ کر کنواں
رخت کب منزل نے باندھا کارواں کے واسطے

گلشن عالم میں وہ دلکش نظارہ ڈھونڈنا
آنکھ کو فرصت نہ ہو، خوب گراں کے واسطے

یہ تو پوشیدہ ہے بے آرامی محنت میں کچھ
جا رہا ہے تو کہاں آرام جاں کے واسطے

روشن از نورمہ حکمت شبستان من است
کاں در گم گشتہ مومن بد امان من است

ہاں، رگ ہمت کو اپنی جوش میں لائے کوئی
عشق اخواں کا اثر دنیا کو دکھلائے کوئی

ہے پریشاں بار ناکامی سے گیسوئے مراد
شانہ دست عطا سے اس کو سلجھائے کوئی

بہر استقبال استادہ ہے ہر گل کی کلی
اس چمن میں صورت باد صبا آئے کوئی

یہ گل و گلزار صدقہ ای یثرب کا ہے
دیکھنا اے باغباں غنچہ نہ مرجھائے کوئی

مدعا کو یہ سکھایا شورش فریاد نے
خود بخود میری طرح منہ سے نکل (۲۲) جائے کوئی

کہہ گئی ذوق کرم کو شوخیے (۲۳) حسن طلب
ہاتھ سے عاشق کا دل بن کر نکل جائے کوئی

اک چھٹا دریا رواں ہونے کو ہے پنجاب میں
ابر کی صور اٹھے، اٹھ کر برس جائے کوئی (۲۴)

تاک میں بیٹھی ہوئی ہے شوخیے (۲۵) دست طلب
دیکھئے اس بزم سے بچ کر کہاں جائے کوئی
جوش ہمدردی میں پنہاں دولت ایمان ہے
نقشہ خیرا القرون آنکھوں کو دکھلائے کوئی (۲۶)

فکر دیں کیساتھ رکھنا فکر دنیا بھی ضرور
ہیں بہت دشمن کہیں دھوکا نہ دے (۲۷) جائے کوئی

خویش را مسلم ہے (۲۸) گوینده وبا ما کار نیست
رشتہ تسبیح شان جز رشتہ زنار نیست

علم کا (۲۹) معشوق رونق بخش کاشانہ تو ہو
انجمن اپنی مثال بزم جانانہ تو ہو

پھر سماں بندھ جائے گا غرناطہ و بغداد کا
پھر ذرا (۳۰) بھولا ہوا تازہ وہ افسانہ تو ہو

بزم میں شوق مے حکمت ہوا پیدا مگر
مے بھی بٹ جائے گی ، پہلے فکر پیمانہ تو ہو

یہ نظامیہ سلامت ہے تو پھر سعدی بہت
پھر ذرا ویسا منور اپنا کاشانہ تو ہو۔

یاد گار فاتحان ہند و اندلس کے ہو (۳۱) تم
شان شاہانہ نہ ہو میری امیرانہ تو ہو

پائمالی (۳۲) ہے جہاں میں ترک حکمت کی سزا
اس چمن سے مثل سبزہ کوئی بیگانہ تو ہو

وہ غنی ہے علم کی دولت بھی کرتا ہے عطا
ہاں مگر پہلی (۳۳) روش تیری گدایانہ تو ہو

آنکھ کو بیدار کر دیتی ہے یہ دیوانگی
کوئی اس حسن جہاں آرا کا دیوانہ تو ہو

رام کر لینا زمانے کا ترے ہاتھوں میں ہے
زندگی تیری جہاں میں دل بایانہ تو ہو

جل کے مر جانا چراغ علم پر مشکل نہیں
پہلے تیرے دل میں پیدا نو پروانہ تو ہو
اے کہ حرف '' اطلبو الوکان بالصین (۳۴) گفتہ
گوہر حکمت بتار جان امت سفتہ

اے کہ بر دلہا رمو عشق آساں کردہ
سینہ ہا را از از تجلی یوسفستاں کر دہ

اے کہ صد طور است پیدا از نشان پائے تو
خاک یثرب را تجلی گاہ عرفاں کردہ

اے کہ ذات تو نہاں در پردہ عین عرب ے
روئے خود را در نقاب میم پنہاں کر دہ

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نور شمع ایماں کردہ

اے کہ ہم خدا (۳۵) باب (۳۶) دیار علم تو
اسے بودی صورت آئینہ حیراں کردہ

فیض تو دشت عرب را مطلع انظار ساخت
خاک ایں ویرانہ را گلشن بداماں کردہ

دل نہ نالد در فراق نو ر حسن تو چرا
خشک چوبے را ز ہجر خویش گریاں کردہ

گل فرستادن بہ بحر بے کراں مے زیبدش
قطرہ بے مایہ را ہم دست طوفاں کردہ

بے عمل را لطف تو (۳۷) لا تقنطوا آموز گشت
بسکہ وا بر ہر کسے باب دبستان کردہ
ہاں دعا کن بہر ما اے مایہ ایمان ما
پر شود از گوہر حکمت سر داماں ما

حواشی

اختر شاہنشاہی ص ۱۷۱

یہ کتاب صحافت نگاری کی اہم تاریخ ہے جو اختر الدولہ حاجی سید محمد اشرف آنریری سکرٹری انجمن علمی و مالک اخبار اختر ہندو اختر پریس نے ۱۸۔۲۲۔۸ سائز میں ۲۹۸ صفحوں میں پہلی مرتبہ جون ۱۸۸۸ء میں شائع کی تھی۔ اس میں ہر اخبار اور ہر گلدستہ اور ہر مطبع کے بارے میں اطلاعات فراہم کی گئیں جن کی تعداد ۱۵۱۸ ہے۔

افسوس کہ کتاب کمیاب ہوتی جارہی ہے۔ اس کے مجھے دو نسخے دستیاب ہوئے۔ ایک کتب خانہ شبلی (ندوہ) لکھنو اور دوسرا پروفیسر سید مسعود حسن رضوی مرحوم کے کتب خانے میں۔ موخر الذکر نسخہ ہر حالت میں بہتر ہے۔ کاش اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوتا۔

۲۔ اختر شناسی ص ۱۵۹

۳۔ ج۔ شوخی

۴۔ ج۔ فریاد

۵۔ ج۔ وہ

۶۔ ''پروانہ'' ندارد

۷۔ ''پروانہ'' میں کو زیادہ ہے۔

۸۔ ج۔ یہ

۹۔ ج۔ یوسف علم استم و پنجاب کنعان من است

از دمید صبح حکمت، چاک، دامان من است

۱۰۔ جہ۔ مصرع اولی کا قافیہ ''بنا'' غلط ہے۔ انہوں نے مصرع یوں لکھا ہے جو درست نہیں ع مجھ میں وہ جادو ہے روحوں کو بنا سکتا ہوں میں

۱۱۔ ج۔ نبوالے

۱۲۔ فارسی کے مشہور شاعر فردوسی طوسی۔ طوسی سے فارسی کا مشہور فلاسفر نصیر الدین بھی ہوسکتا ہے۔

۱۳۔ امام رازی

۱۴۔ مشہور عالم حکیم ابو علی سینا

۱۵۔ فارسی کے مشہور شاعر

۱۶۔ امام محمد غزالی

۱۷۔ ج۔ڈھونڈتی

۱۸۔ ج۔ہمت

۱۹۔ یہ خیر نال پنجابی گل (محاورہ) ہے (ایڈیٹر) ج میں مصرعہ یوں ہے۔ہاں جسے چھونا ہو دامان ثریا کو بھی''

۲۰۔ ج۔آرزوئے دل کو بھی کہنا کوئی دشوار ہے۔کام خاموشی سے تجھ کو اے لب اظہار کیا۔

۲۱۔ پروانہ۔پا سہو کاتب

۲۲۔ ج۔نکل آئے

۲۳۔ ج۔شوخی

۲۴۔ پروانہ ،ندارد

۲۵۔ ج۔شوخی۔

۲۶۔ ج میں یہ شعر ''ہاں رگ ہمت کو اپنی......الخ کے بعد ہے۔

۲۷۔ ج۔کہا

۲۸۔ ج۔ہمی

۲۹۔ ج۔محبوب

۳۰۔ پروانہ۔پھولا سہو کتابت

۳۱۔ ج۔ہو تمہیں

۳۲۔ ج۔پایمالی۔

۳۳۔ ج۔پہلے

۳۴۔ ج۔لوکان بالسین غلط ہے۔صحیح ''بالصین'' ہے ہے۔الصین چین کو کہتے ہیں۔

۳۵۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف اشارہ ہے۔علی ،اللہ کے ناموں

میں سے ایک ہے۔مثلاً یا علی یا عظیم

۳۶۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تعریف میں مشہور حدیث رسول اکرم ﷺ ہے۔انا مدینۃ العلم وعلی بابہا یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔

۳۷۔ آیت قرآنی ہے یعنی تم ہماری رحمتوں سے ناامید نہ ہو جاؤ۔

All rights reserved. ©2002-2006

عراقی اور اقبال

پروفیسر ڈاکٹر محمد اختر چیمہ

شیخ فخر الدین ابراہیم عراقی ہمدانی (م ۶۸۸ھ ۱۲۸۹ء)(۱) حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی سہروردی کے مرید، خلیفہ اور داماد تھے۔ اس کے علاوہ تصوف کی تعلیم میں شیخ صدر الدین محمد بن اسحاق قونوی شارح ابن عربی کے شاگرد رشید بھی تھے۔ نیز آپ ان مشائخ صوفیاء، عرفا عظام اور شعراء کرام کے اس طبقے سے بھی متعلق ہیں جن سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے اپنے آثار و اشعار میں انھیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اعجاز الحق قدوسی نے اپنی تالیف ''اقبال کے محبوب صوفیہ'' میں اکتیس شخصیات نامدار کا تذکرہ کیا ہے جن میں شیخ ابو سعید ابو الخیر، حکیم سنائی غزنوی۔ خواجہ عطار نیشاپوری، مولانا روم، شیخ محمود، شستری، بوعلی قلندر۔ پانی پتی۔ امیر خسرو دہلوی اور مولانا جامی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ چونکہ علامہ اقبال بھی اپنے مخصوص افکار و نظریات کے اظہار کے لئے شعر ہی کو ذریعہ بنایا۔ اور آپکا بیشتر کلام فارسی زبان میں ہے۔ اس لیے ناگزیر ہے کہ اس ضمن میں فارسی شعر کے حوالے سے بات کی جائے۔

ہم حضرت عراقی اور علامہ اقبال کے فکری رابطے کو تین پہلوؤں سے زیر بحث لائیں گے۔

۱۔ شیخ عراقی کا اشعار کا عکس علامہ اقبال کے کلام میں۔

۲۔ حضرت عراقی، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے عرفانی مکتب کے نمائندہ تھے۔ اس لحاظ سے علامہ اقبال کہاں تک ان سے متاثر ہوئے۔

۳۔ علامہ اقبال نے زمان و مکان کی بحث ۔۔درست یا نادرست ۔۔عراقی کا نام استعمال کیا ہے ۔اس حوالے سے ایک جائزہ

کلام اقبال کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اگرچہ شعرائے سبک ہندی مثلاً عرفی، فیضی، ظہوری، ابو طالب کلیم، غنی، صائب اور غالب وغیرہ کے دیوان بغور پڑھے اور ایک مدت تک انکے اشعار کو اپنے لئے دلیل راہ بنایا۔ لیکن جلد ہی اقبال انکے اسلوب شعر سے دل برداشتہ ہو کر سبک خراسانی، اور بالخصوص سبک عراقی کیطرف راغب ہو گئے۔ اس طرح آپ نے سرزمین ہند میں فارسی شعر کو سبک ہندی کی محدود فضا سے ۔۔جو گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری میں بعض خیال بافوں کے توسط سے ایک لاینحل مسئلے کی صورت اختیار کر گیا تھا۔۔ نجات دلای۔ اقبال کا نقطہ نظر یہ تھا کہ سبک ہندی میں سستی، کاہلی اور باریک بینی و پیچیدگی کارفرما ہے لہذا آپ نے ایران کے مذکورہ بالا بزرگ متصوفین کے سبک ''سمبولیسم'' کو اپنا لیا اور فارسی غزلیات و منظومات کی بدولت ابتکاری نوعیت کے کام سر انجام دیئے۔ (۲)

استاد سعید نفیسی نے اس حقیقت کی تائید میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

'' محمد اقبال از آن کسنی بود کہ می بایست دفتر پشینیان را در نوردد۔ سبک معروف۔ اسپر سیو نیسم ۔ شعر فارسی را کہ در بند کم کم فرسودہ و مدروس شدہ بود بہ روش روشن تر و شیوا تر یعنی ''سمبولیسم'' مشایخ بزرگ تصوف، ایران مانند سنائی و فریدالدین عطار و فخر الدین عراقی و جلال الدین بلخی محمود شبستری باز گرداند۔ قرنہا بود کہ دشواری فوق العادہ اب روش ہمہ را از آن دور کردہ بود و احیاناً ترسانیدہ بود و کسی جرات نکی کرد کہ

دوش بدوش و سر بسر حدیقتہ الحقیقہ و مثنویات عطار و مثنوی مولانا و گلشن راس بگزارد۔ ابن بابغہ پاکستانی ابن دلاوری را کرد واز عہدہ ہم برآمد۔ گویا سی گفت۔ میگو ہم وہی آپیش از عہدہ برون! اینک آثار اوچوں برہانی قاطع و قاطع برہن درپیش ساست۔ سی پیرو ہمان روش مالوف وپسندیدہ ابن مشائخ تصوف ایران در زبان فارسی بودہ است۔ منتہی تصوجی کہ کاملا با معارف جدید و فلسفہ ہا و حکمتہای نوین از شرق و غرب آمیختہ شدہ و صبغئہ شدہ و وہ صبغئہ قرن نوزدہم و بیستم میلادی را بخود گرفتہ است۔ (۳)

ترجمہ: محمد اقبال ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے قدما کے دفتر کو لپیٹ دیا۔ ان کی آرزو تھی کہ وہ فارسی شعر کے معروف اسلوب امپر سیونیسم کو جو سرزمین پاکستان و ہند میں آہستہ آہستہ فرسودہ اور کہنہ ہو گیا تھا۔ سبک سمبولیسم مشائخ صوفیہ ایران مثلاً حکیم سنائی، فریدالدین عطار، فخرالدین عراقی، جلال الدین رومی اور محمود شبستری کی روشن تر اور فصیح تر روش میں تبدیل کر دیں۔ کئی صدیاں گزر گئی تھیں۔ کہ اس اسلوب کی غیر معمولی دشواری نے سب کو اس سے دور اور قدرے خوفزدہ کر دیا تھا اور کوئی شخص یہ جسارت نہیں کرتا تھا کہ وہ حدیقہ سنائی، مثنویات عطار، مثنوی مولوی اور گلشن راز شبستری کی ہمسری کرے۔ اس نابالغ روزگار شخصیت نے یہ دلیری کی۔ اور اس سے عہدہ برآ بھی ہوئی۔ گویا۔ اقبال کہتے تھے: ”می گویم و سی آیمش از عہدہ بروق“

چنانچہ اب آپکی شعری تخلیقات تخلیقات بطور برہان قاطع اور دلیل محکم ہمارے سامنے موجود ہیں۔ آپ نے فارسی زبان میں ایران کے صوفی شعراء کی مرغوب اور

پسندیدہ روش کی پیروی کی ہے۔ البتہ آپ نے اس تصوف کو مشرق و مغرب میں مروجہ جدید فلسفیانہ اور حکیمانہ معارف سے مکمل طور پر ہم آہنگ کر دیا۔ اور انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کو بقول ملک الشعرائی بہار ''عصر حاضر خاصہ اقبال'' بنا دیا ہے۔

علامہ اقبال ان نامبردہ مشائخ ایران اور صوفی شعراء میں سے مولانا روم سے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ اقبال نے اپنے متعدد اشعار میں مولانا روم کی مریدی کا دعویٰ کیا ہے۔ اپنے آپ کو مولوی کا دلدادہ اور شیفتہ ظاہر کیا ہے اور راہ تصوف و معرفت میں اپنی تمام تر ترقی اور پیشرفت کو مولوی رومی کی ہدایت و ارشاد باطنی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ شیخ عراقی بھی مولوی کے ہم نشینوں میں سے تھے۔ قونیہ میں قیام کے دوران دونوں بزرگوار اکٹھے مجالس و محافل سماع میں شریک ہوتے تھے۔ افلا کی کی کتاب ''مناقب العارفین'' میں مولوی بلخی اور عراقی صمدانی کے روابط پر مشتمل تین حکایات درج ہیں۔ (۴) مثلاً ایک جگہ منقول ہے۔

''پیوستہ شیخ فخر الدین در سماع مدرسہ حاضر سدی و دایما''

از عظمت مولانا باز گفتی و آہ ہا زدی و گفتی کہ او را ہیچ کسی کما

ینبغی ادارک نکرد، در بن عالم غریب، مدو غریب رفت۔ (۵)

ظاہری ملاقات کے علاوہ آپ کے شور و شوق اور معنوی ربط و تعلق کو بھی پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ ذیل میں ہر دو شیوخ کی ایک ایک ہم وزن غزل کا مطلع نمونہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اور لطف یہ کہ علامہ اقبال نے بھی ان کے استقبال میں ایک معرکہ آرا غزل کہی ہے:

مولوی۔ بنمای رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست

بگشای لب کہ قند فراوانم آرزوست (۶)

عراقی۔ یک لحظہ دیدن رخ جانانم آرزوست

یک دم وصال آن مہ خوبانم آرزوست (۷)

اقبال۔ تیر وسنان وخنجر وشمشیرم آرزوست

بامن میا کہ مسلک شبیرم آرزورست (۸)

اعجاز الحق قدوسی لکھتے ہیں

''حضرت عراقی کی شاعرانہ عظمت ہر دور میں مسلم رہی ہے۔انہوں نے فارسی شاعری میں تصوف کی روایات کو نکھارا اور سنوارا، اور تصوف کے مضامین کو اپنے اشعار میں اس دلکشی سے سمویا ہے کہ آج بھی اہل نظر ان کے کلام کو حرز جاں بنائے ہوئے ہیں۔(۹)

پروفیسر ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ کی روایت کے مطابق۔اقبال عراقی سے بھی متاثر ہوا ہے۔

اپنے اشعار میں اس کا نام لیتا ہے۔اور اس کے بعض اشعار کو تضمین کرتا ہے۔ عراقی کی اس مشہور عارفانہ غزل کی پیروی میں ع

نخستین بادہ کاندر جام کردند

ز چشم مست ساقی وم کردند (۱۰)

اقبال نے یہ غزل کہ ہے جو قطعی طور پر فلسفیانہ رنگ لئے ہوئے ہے۔

فنا را بادہ ہر جام کردند

چہ بیدر دانہ او را عام کردند

حضرت عراقی کی اسی الہامی غزل کے پہلے مصرع کو علامہ اقبال نے اپنی ایک دلکش ''رباعی''میں یوں تضمین کیا ہے۔

گناہ عشق و مستی عام کردند

دلیل پختگان را خام کردند

با هنگ حجازی می سر ایم

نخستین باده کاندر جام کردند

اوراسی غزل کے مطلع کے دوسرے مصرع کو ''پیام مشرق'' کی ایک ''رباعی''

میں اقبال نے اس طرح استعمال کیا ہے۔

بخود باز آور رند کہن را

می با نا کہ من در جام کر دم

من این امی چون مغان دور پیشن

ز چشم مست ساقی وام کر دم

علامہ اقبال اپنے کلام میں ایک جگہ شیخ عراقی کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مولانا جامی کا نام بھی لیتے ہیں۔حضرت عراقی اور جامی دونوں شاعرانہ عظمت کے ساتھ تصوف میں بلند مقام رکھتے ہیں۔دونوں بحر معرفت کے شناور ہیں۔اور دونوں کے اشعار میں تصوف وعرفان اور شیخ اکبر کے فلسفہ وحدت الوجود کی چاشنی بدرجہ اتم موجو ہے۔علامہ اقبال نے ''ارمغان حجاز'' کے ایک قطعے میں دونوں کا ذکر نہایت دلسوزی سےکیا ہے۔فرماتے ہیں ع۔

گہی شعر عراقی را بخوانم

گہی جامی زند آتش بجانم

ندانم گرہ اہنگ عرب را

شریک نغمہ ہای سر بانم (۱۴)

پروفیسر ڈاکٹر سید محمد اکرم شاہ تحریر فرماتے ہیں:

''اگر چہ اقبال کی مثنویوں کی تعداد اس کی غزلوں کی نسبت بہت زیادہ ہے،

لیکن اس کی آہنگ پرور طبیعت ، جو آسمانی نغموں سے لبریز تھی، غزل کی طرف بھی بہت مائل رہی ۔ چنانچہ پہلی دو مثنویوں (اسرار خودی اور رموز بیخودی) کے علاوہ اس کی بقیہ تمام مثنویوں میں غزل ملتی ہے۔ ''جاوید نامل'' جو اس کی معرکہ آرا مثنوی ہے، گونا گوں غزلوں سے مملو ہے اور یہ سبک شاید پہلی دفعہ فارسی شاعری میں اقبال کے ہاتھوں شروع ہوا ہے (۱۵)

راقم الحروف کی تحقیق کے مطابق شیخ عراقی اس فن ابتکاری یعنی مثنوی میں غزل سرائی کے بانی ہیں۔ شیخ عراقی تا حال وہ پہلی ہستی ہیں جنہوں نے اپنی یگانہ مثنوی عشاقنامہ میں اس جدت کا آغاز فرمایا۔ ہر فصل میں ایک ایک غزل سموئی۔ عراقی کے بعد ساتویں آٹھویں صدی ہجری میں متعدد مثنویاں اس طرز پر بالخصوص '' دہ نامہ '' معرض وجود میں آئیں جن میں غزل شامل تھی۔ اس ضمن میں ھمام تبریزی۔ اوحد، مراغی، رکن صاین سمنانی ،عبید زاکانی، ابن نصوح فارسی اور ابن عماد خراسانی جیسے شاعروں کے نام لئے جا سکتے ہیں ۔ (۱۶) یہ خاصیت دو ناموں کے علاوہ بعض دوسری فارسی مثنویوں مثلاً صحبت نامہ ھمام تبریزی (۱۷) اور قران اسعدین امیر خسرو دہلوی (۱۸) میں بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہے ۔

چنانچہ موجودہ صورت حال میں اس فن میں حق تقدیم شیخ عراقی کو حاصل ہے اور علامہ اقبال نے اس دور آخر میں آ کر اس فن انیق کو عروج پر پہنچا دیا ہے ۔ بعید نہیں کہ عراقی کی یہ مثنوی ۔۔ جو حدیقہ سنائی کے وزن پر ہے اور جس میں دردوسوز عشق درجہ کمال کو پہنچا ہوا ہے ۔ اقبال کے مطالعہ میں آئی ہو ۔

(۲)

شاعر مشرق علامہ محمد اقبال نے شیخ ابن عربی اور حضرت عراقی کے فلسفہ وحدت الوجود کی تاثیر کس حد تک قبول کی ۔ ۔ حکیم الامت علامہ اقبال کے متعلق بعض حلقوں میں اظہار خیال کیا جاتا ہے کہ وہ تصوف کے مخالف تھے ۔ اس غلط فہمی کی بنیاد دراصل

اس بات پر مبنی ہے کہ اقبال نے اپنی منظوم و منثور تصانیف میں جا بجا اس تصوف کی مخالفت کی ہے جس کا سرچشمہ اور ماخذ قرآن و حدیث نہیں۔ اقبال درحقیقت غیر اسلامی تصوف اور صوفیائے خام کے خلاف تھے۔ بلکہ وہ اس تصوف کے خلاف سینہ سپر تھے جس کا خمیر عجمی خیالات اور فلسفے کی آمیزش سے تیار کیا گیا تھا۔ اور جس نے خالص اسلامی تصوف کے سرچشموں کو گدلا کر دیا تھا۔ انہوں نے شیخ محی الدین ابن عربی اور خواجہ حافظ شیرازی کی اس لئے مخالفت کی کہ ان کے مخلصانہ عقیدے کے مطابق اول الذکر نے مسئلہ وحدت الوجود کو فلسفے کی شکل دے کی اسلامی تصوف کا ایک لازمی جزو بنا دیا۔ اور ان کے اس نظریے کی دل آویزی نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ برصغیر میں حضرت مجدد الف ثانی سے پہلے تک اکثر اکابر صوفیہ اس نظریے کی رنگینیوں سے متاثر رہے۔ شیخ ابن عربی کے فکر رسا نے اس نظریے کو وہ توانائی اور رعنائی بخشی کہ کسی کو اس کے برعکس مجال سخن نہ تھی۔ شیخ ابن عربی اپنی کتب و تصانیف میں مصر ہیں کہ وحدت الوجود کی بنیاد عین اسلامی تعلیمات پر رکھی گئی ہے۔ انہوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں قرآن و حدیث سے متعدد دلائل پیش کئے ہیں۔ ان کے ہم عصر اور بعد کے صوفیہ نے ان کے س نظریے کو نہ صرف قبول کیا، بلکہ اپنی تعلیمات کا جزو بنایا۔ پھر عربی، فارسی، اور اردو کے نامور صوفی شعراء نے اس فلسفے کو شعر کیسانچے میں ڈھال کر اس کی خوب تبلغ کی۔ شیخ فخر الدین عراقی نے سب سے پہلے رسالہ ''لمعات'' میں جو نظم و نثر پر مشتمل ہے۔ اس فکر کو شعر کے قالب میں ڈھالا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ عراقی نے فلسفہ ابن عربی کا خلاصہ اس مختصر رسالے میں پیش کر دیا۔ بقول ڈاکٹر سید حسین نصر:

> ''کتاب المعات ۔۔۔۔ بیش از ہر کتاب دیگر اور معرجی ابن عربی بہ فارسی زبانان تاثیر داشتہ است۔ (۱۹)

پھر آخر الذکر خواجہ حافظ شیرازی نے اپنی نوائی اور سحر بیانی سے غزل کے روپ

میں نظریہ وحدت الوجود کو دو آتشہ کر دیا۔ لیکن بقول علامہ اقبال یہ نظریہ اس قدر سکر آلود اور خواب آور تھا کہ اس نے مسلمانوں کی زندگی پر نہایت ہی ناخوشگوار اثر ڈالا۔ خودی کی نفی نے ذوق عمل اور جد و جہد کی رفتار کو مفقود کر دیا، عمل محکم اور سعی پیہم کا تصور محض خواب و خیال ہو کر رہ گیا۔ پھر سر مستی و رندی کی تلقین نے جزا و سزا کے تصور کو مضمحل کر دیا۔

بہر حال دونوں خیالات کے بزرگ اپنے پاس دلائل و براہین رکھتے ہیں۔ (۲۰)

علامہ اقبال نظریہ وحدت الوجود کا ماخذ افلاطون کے نظریہ تصورات کو بتاتے ہیں جس کو صوفیہ اعیان ثابتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقبال اسے فلفہ افلاطونی کے نام سے تا د کرتے ہیں اور کوہستان وجود میں اس فلسفے کو زہر قرار دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس فلسفے نے قوم کو ایک ایسا نشہ پلایا ہے کہ جس نے قوم کے افراد کو خودی سے نابلد کر کے ذوق عمل سے محروم کر دیا ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ صوفیوں نے اپنے آپ کو اس فلسفے میں اس طرح جذب کیا کہ وہ اسلامی نظریہ حیات کے مطابق نظر آنے لگا ہے۔ علامہ اقبال نے مثنوی اسرار خودی میں شیر ہو گوسفند کی حکایت لکھ کر تمثیلی طور پر اس بات کی واضح دلیل دی ہے کہ کس طرح گوسفندے۔۔ جس سے ان کی مراد افلاطون ہے۔۔ شیر۔۔ یعنی ملت اسلامیہ۔۔ کو نفی خودی کی تعلیم دی ہے۔ ہم یہاں مضمون کی طوالت کے خوف سے نظم کا پہلا اور آخری شعر پیش کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

راہب دیرینہ افلا طوں حکیم
از گروہ گوسفندان قدیم

اور آخری شعر: قومہا از سکر او مسموم گشت
خفت و از ذو ق عمل محروم گشت (۲۱)

اس حکایت میں علامہ اقبال نے نہایت خلوص سے ان صوفیہ پر تنقید کی ہے جنہوں نے افلاطون کے اس فلسفے کو روح اسلام سے بے نیاز ہو کر اپنایا۔ پھر اس کو ایسے دلکش انداز میں پیش کیا کہ وہ بادی النظر میں عین اسلامی تعلیمات کے مطابق نظر آنے لگا۔ علامہ اقبال نے شیخ ابن عربی اور حافظ شرازی کی مخالفت محض مسئلہ وحدت الوجود کی بنا پر کی تھی ورنہ وہ شیخ اکبر کی صوفیانہ عظمت کے قائل تھے (۲۲) اور حافظ کی غزل گوئی کے مداح تھے۔ حافظ نے عراقی کی بعض غزلوں کو سراہا (۲۳) اور اقبال نے حافظ کے وزن اور رنگ میں کئی غزلیں کہی ہیں۔ (۲۴) اس طرح بالواسطہ ہی سہی اقبال عراقی کے زیر اثر نظر آتے ہیں۔

ایک روایت کے مطابق۔

اس حکایت میں علامہ اقبال نے نہایت خلوص سے ان صوفیہ پر تنقید کی ہے جنہوں نے افلاطون کے اس فلسفے کو روح اسلام سے بے نیاز ہو کر اپنایا۔ پھر اس کو ایسے دلکش انداز میں پیش کیا کہ وہ بادی النظر میں عین اسلامی تعلیمات کے مطابق نظر آنے لگا۔ علامہ اقبال شیخ ابن عربی اور حافظ شیرازی کی مخالفت مسئلہ وحدت الوجود کی بنا پر کی تھی۔ ورنہ وہ شیخ اکبری کی صوفیانہ عظمت کے قائل تھے (۲۲) اور حافظ کی غزل گوئی کے مداح تھے۔ حافظ نے عراقی کی بعض غزلوں کو سراہا (۲۳) اور اقبال نے حافظ کے وزن اور رنگ میں کئی غزلیں کہی ہیں۔ (۲۴) اس طرح بالواسطہ ہی سہی اقبال، عراقی کے زیر اثر نظر آتے ہیں۔

ایک روایت کے مطابق۔

"شیخ ابن عربی نے منصور حلاج کے نعرۂ انا الحق کو پہلی مرتبہ فلسفہ وحدت الوجود کی شکل بخشی۔ ان کے نظریہ وحدت الوجود کو مقبول بنانے میں مختلف دور کے صوفیہ اور شعراء نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ (۲۵)۔ (ان میں عراقی اور حافظ کیا نام خاص طور پر شہرت کے حامل ہیں)

علامہ اقبال، سراج الدین پال کے نام ۱۹ جولائی ۱۹۱۶ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے المعات میں فصوص الحکم'' محی الدین ابن عربی کی تعلیمات کو نظر کیا ہے۔ اور سب سے آخری شاعر حافظ ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ جس قوم میں طاقت وتوانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی۔ تو پھر اس قوم کا نکتہ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین وجمیل شے ہو جاتی ہے۔ اور ترک دنیا موجب تسکین اور اس ترک دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی وکاہلی اور شکست کو چھپایا کرتی ہیں۔(۲۶)

شاعر ملی پاکستان نے ان مضر اثرات کو دیکھ کر ہی جو آپ کی رائے میں نظریہ وحدت الوجود کے باعث معاشرے میں مرتب ہو رہے تھے۔ ان بزرگوں کے بعض نظریوں کی مخالفت کی تھی۔ آپ صوفیائے خام، نام نہاد پیروں اور رسمی تصوف کو ہمیشہ ہدف تنقید ٹھہراتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں حضرت اکبر آلہ آبادی کو تحریر فرماتے ہیں۔

''یہاں لاہور میں ضرورت اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں۔۔۔۔

صوفیہ کی دکانیں ہیں، مگر وہاں سیرت اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔(۲۷)

لیکن جہاں تک خالص اسلامی تصوف کا تعلق ہے۔ اقبال نہ صرف اس کے قائل اور گرویدہ تھے۔ بلکہ وہ خود سلسلہ قادریہ میں بیعت تھے۔ اور ان صوفیائے کرام اور پیران عظام سے والہانہ عقیدت ورادات رکھتے تھے۔ جنہوں نے اسلامی تصوف کو اپنے حکیمانہ نظریات سے پروان چڑھایا۔

اقبال شریعت محمدی کے آئینے میں حقیقت الہٰیہ کا جمال دیکھنا چاہتے تھے۔ لہٰذا

جس آئینہ گگر کے آئینے میں یہ جمال ہم آہنگ ہو کر نظر آ جاتا ہے وہ اس کے والہ و شیدا ہو جاتے۔ اقبال ان صوفیائے باصفا کے بیحد مداح و معترف ہیں جنہوں نے ملت اسلامیہ کے جسد میں نئی روح پھونکی۔ زوال و انحطاط کے دور میں احیائے دین کیلئے راستے تلاش کئے اور مسلمانوں کی دینی اور سماجی زندگی کے سدھارنے میں عظیم الشان کارنامے انجام دیے۔ جب کبھی امت مسلمہ پر کوئی نازک وقت آیا۔ انہوں نے بصیرت و حکمت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا اور اسلامی معاشرے کا قبلہ درست رکھنے کے لئے انتھک کوششیں کیں۔ علامہ اقبال نے اپنے شعری اور نثری مجموعوں میں ان بزرگوں کے نام لے لے کر انکی بارگاہ عالی مرتبت میں خراج تحسین پیش کیا ہے جن سے وہ بہت زیادہ متاثر ہوئے اور جن کی مشائک کی مساعی جمیلہ نے اسلامی روح، اسلامی فکر، اسلامی کردار اور اسلامی سرمایہ زندگی کو تباہ ہونے سے بچالیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ شریعت اور طریقت کو ہم آہنگ کر کے اپنی تبلیغی جدوجہد اور روحانی تصوف سے انسانی قلوب پر اثر انداز ہوئے اور دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ (۲۸)

اس سلسلے میں مفکر اسلام علامہ اقبال و حضرت مجدد الف ثانی سرہندی کے نظریہ وحدت الشہود (ہمہ از اوست) نے زیادہ متاثر کیا۔ اقبال کے خیال میں ملت اسلامیہ میں فلسفہ وحدت الوجود (ہمہ اوست) کے عام ہونے کی وجہ سے قوت عمل سے محرومی، ترک جدوجہد، ناتوانی، کاہلی سستی اور مایوسی جیسے عوامل در آئے۔ اس لیے انہوں نے ان منفی عوامل کو زائل کرنے کی غرض سے اپنی فکری کاوشوں سے خودی کے لازوال فلسفے کو قرآن وحدیث سے اخذ کر کے افکار اسلامیہ کے ساتھ ہم آہنگ کر دیا۔ چنانچہ اسرار خودی میں فرماتے ہیں۔

پیکر ہستی ز آثار خودی است
مرچہ می بیٹی ز اسرا خودی است (۲۹)

علامہ اقبال کے فلسفہ خودی نے تصوف کی دنیا کو ایک نئی راہ دکھائی۔ اقبال بنی نوع انسان کو خودی سے آراستہ کر کے کائنات کی تسخیر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے۔ ذہن انسانی میں فکر و عمل اور محنت کی عظمت کی نئی شمع روشن کرتے ہیں۔ فلسفہ خودی میں اپنے آپ کو مولانا روم کا فیض یافتہ قرار دیتے ہیں۔ مولانا روم اگرچہ مسلک وحدت الوجود کے قائل تھے، مگر ان کے کلام میں فلسفہ خودی کی بھی جھلکیاں ملتی ہیں۔ تاہم علامہ نے فلسفہ خودی کو اپنے فکر کا موضوع خاص بنا کر ایک ایسا رنگ و آہنگ بخشا ہے کہ اگر انہیں فلسفہ خودی کا موسس کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ (۳۰)

علامہ اقبال عشق و محبت کی بدولت خودی کو مستحکم کر کے ایک مسلمان کو مرد مومن کے مرتبے تک پہنچاتے ہیں۔ شیخ ابن عربی اور مولانا روم نے بھی اپنے آثار و اشعار میں ''انسان کامل'' کے تصور کو منظم طور پر پیش کیا ہے۔ حضرت عراقی اپنی یگانہ مثنوی ایک داستان میں کمال آدمیت در عاشقی است۔ (۳۱)

کے فکر کو نظم کر کے انساں کامل کے لیے پایہ ثبوت فراہم کیا ہے اور آپ کے دیگر آثار میں بھی اس کی علامات پائی جاتی ہیں اقبال کے نزدیک بھی عشق کا تصور نہایت وسعت رکھتا ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ ایک ایسی قوت ہے جو خودی کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔ تسخیر کائنات کی جانب نت نئی آرزوئیں پیدا کر کے انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔ اور کٹھن اور پرخطر راہوں میں خضر راہ کا کام سر انجام دیتی ہے۔ اسی کی وساطت سے ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی کی تمناسیوں میں بیدار ہوتی ہے۔ اور مرحلہ ہائے شوق کا تسلسل قائم ہوتا ہے۔ اور اس کی اصل کل یوم ھو فی شان (۳۲) سے متعلق ہے جو زندگی کا راز اور روح کائنات ہے۔ (۳۳)

(۳)

زمان و مکان کی بحث میں علامہ اقبال کی حضرت عراقی کے اقوال سے استناد بھی محل نظر ہے۔

تشکیل جدید الہیات اسلامیہ (۳۴) میں علامہ اقبال نے زمان و مکان کے مباحث میں کئی مقامات پر صوفی شاعر عراقی کے حوالے سے مطالب نقل کر کے ان پر تنقید کی ہے۔ جدید محققین میں سے مولانا امتیاز علی خان عرشی (۳۵)، راقم الحروف (۳۶) اور فارسی مخطوطات کے فہرست نگار احمد منزوی (۳۷) اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ مطالب علامہ اقبال نے رسالہ ''رغایۃ المکان فی معرفتہ الزمان'' (۳۸) سے اخذ کیے ہیں اور رسالے اس قلمی نسخے کو جو علامہ کے زیر استفادہ تھا، غلطی سے عراقی کے نام منسوب کیا گیا ہے۔ سید عبدالوحید نے انگریزی کتاب Thoughts and Reflections of Iqbal میں اس ضمن میں ایک جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ بھی محل نظر ہے۔ (۳۹) درحقیقت یہ رسالہ حضرت تاج الدین محمود ابن خداداد اشنہی ھمدانی کی تالیفات میں سے ہے اور اٹک، کیمبل پور (پاکستان) میں چھپ چکا ہے۔ شیخ عراقی کے علاوہ سے شمس الدین محمد بن عبدالملک ویلمی ۔۔۔ استاد اشنہی (۴۰) عین القضاۃ ھمدانی (م ۸۶ھ) (۴۱) شیخ روز بہان بقلی شیرازی (م ۶۰۶ھ) شیخ محمود شبستری (م ۷۲۰ھ) اور شیخ محمود گاواں (۸۸۶ھ) کے نام بھی منسوب کرتے ہیں (۴۱) دکتر رحیم فرمنش نے ''غایۃ الامکان فی درایۃ المکان یا ''رسالہ الامکنہ والازمنہ'' کے نام سے اسے عین القضاۃ کی تالیف کے طور پر جداگانہ اور احوال و آثار عین القضاہ'' کے ساتھ تہران سے ۱۳۳۹ شمسی میں شائع کیا ہے۔

سید عبدالوحید نے اس موضوع پر انگریزی زبان میں تبصرے استناد و استشہاد کی خاطر رسالے کے کسی نسخے میں سے درج ذیل فارسی اقتباس درج کیا ہے۔ جس میں عراقی کا نام اس طرح ثبت ہے:

''تا این مخدرہ غیبی ۔۔ چون بمشاطگی بیان این بندہ ضعیف باخرزمائیان (؟) جلوہ کند، امیدوارم کہ تشنگان جرعہ حقیقت درایام آخرالزمان ازدست

این ساقی عراقی جمال زلال شیرین مشاہد نمایند۔ (۴۳)

لیکن دکتر رحیم فرمنش کے مطبوعہ نسخے میں یہی اقتباس قدرے اختلاف کے ساتھ عراقی کے لفظ کے بغیر یوں تحریر ہے:

خداوندا این مخدرہ غیبی ۔۔۔ بر دست مشاطہ ہدایت وتوفیق بر طالبان آخرالزمان جلوہ کن ووتشنگان آخرالزمان را کہ در بیدای حیرت سرگردانند بر دست ساقی لطف شربتی شافی فرست ۔۔۔۔۔ (۴۴)

معلوم ہوتا ہے کہ کسی کاتب نسخہ کی تحریف سے ایسے ہوا ہے ورنہ اشنہی کے مولف نسخہ ہونے میں اب شک باقی نہیں ہے۔ البتہ رسال غایۃ الامکان فی درایۃ المکان میں ذیل کے دو شعر یکجا ضبط ہیں۔

اندرین بحر بیکران چون غوک
دست و پائی بزن، چہ دانی بوک

اندرین رہ اگرچہ آن نکنی
دست و پائی بزن، زین نکنی

جو بقول مولانا امتیاز علی خاں عرشی حکیم سنائی کی مشہور مثنوی حدیقۃ الحقیقہ سے ماخوذ ہیں (۴۷) اور راقم الحروف نے یہ دونوں شعر ''لمعات عراقی'' کے اٹھائیسویں لمعہ میں ملاحظہ کیے ہیں (۴۸)

یہ ہے عراقی اور اقبال کے فکری روابط کا مختصر بیان جو راقم الحروف اپنی رائے کے مطابق تا حال سمجھ سکا ہے۔

حواشی

۱۔ شیخ عراقی کے ترجمہ احوال و آثار وافکار اور اشعار کے بارے میں تفصیلی

معلومات حاصل کرنے کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔

عشاقنامہ شیخ فخر الدین عراقی مع سوانح عمری وی، تج آربری، بمبئی ۱۳۵۷ھ

مقدمہ دیوان عراقی و دیباچہ سعید نفیسی، چاپ در کلیات شیخ فخر الدین ابراہیم ھمدانی متخلص بہ عراقی چاپ چہارم، از انتشارات کتابخانہ سنائی تہران ۱۳۳۸ش

تذکرہ و میخانہ، تالیف ملا عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی، باہتمام احمد گلچین معانی، تہران ۱۳۴۰ش، ص ۲۷۔۵۶

مقام شیخ فخر الدین ابراہیم عراقی در تصوف اسلامی، مقالہ ڈاکٹریٹ محمد اختر چیمہ، دانشگاہ تہران سال ۵۳۔۱۳۵۶ش (غیر مطبوعہ)

مختصری در شرح حال و آثار و عقاید شیخ فخر الدین عراقی۔ محمد اختر چیمہ، مطبوعہ در مجلہ دانشکدہ ادبیات و علوم انسانی، دانشگاہ فردوسی، مشہد، سال ۱۲، شمارہ ۲، ۱۳۵۵، ش، ص ۳۴۴۔۳۶۲۔

۲۔ اقبال در راہ مولوی، نگارش دکتر سید محمد اکرم، ناشر انجمن دوستی ایران و پاکستان، لاہور، ۱۹۷۰، ص ۹

۳۔ رومی عصر ۔۔۔۔ علامہ محمد اقبال، تالیف خواجہ عبدالمجید عرفانی، ناشر کانون معرفت تہران مقدمہ بقلم استاد سعید نفیسی۔ ص الف اور ملاحظہ کیجئے اقبال اور راہ مولوی ص ۹۷۔۹۸

۴۔ باتصحیحات تحسین یازیجی انقرہ ۱۹۵۹۔۱۹۶۱، ۱، ۳۶۰، ۳۹۹۔۴۰۰، ۲، ۵۹۴۔۵۹۶

۵۔ مناقب العارفین افلاکی، ۱، ۴۰۰ نیز ملاحظہ کیجئے، شرح مثنوی شریف تالیف بدیع الزمان فروزانفر، انتشارات دانشگاہ تہران ۱۳۴۶ش، ۱، ۱۲اقبال در راہ مولوی، ص ۲۲۱

۶۔ کلیات شمس باتصحیحات و حواشی بدیع الزمان فروزانفر، انتشارات دانشگاہ

تہران ۱۳۳۶ش، ۲۵۵۱۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولوی کی اسی غزل میں سے تین اشعار کو علامہ اقبال نے مثنوی، اسرار خودی کے سرورق پر درج کر کے اپنی ارادت کا ثبوت دیا ہے۔

۷۔ کلیات عراقی، غزلیات، ص ۱۵۷

۸۔ کلیات اقبال لاہوری، بوسیلہ احمد سروش، از انتشارات کتابخانہ سنائی تہران، پیام مشرق، ص ۲۴۸

۹۔ اقبال کے محبوب صوفیہ۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور، طبع دوم ۱۹۸۲ص ۲۱۵

۱۰۔ کلیات عراقی، غزلیات، ص ۱۹۳

۱۱۔ ایران نامہ (منتخبات از مجلہ اقبال) مرتبہ گوہر نوشاہی، بزم اقبال لاہور ۱۹۷۱ء مقالہ: اقبال اور غزل از سید محمد اکرم، ص ۲۶۱ اور ملاحظہ کیجئے، اقبال درراہ مولوی ص ۱۱۴ کلیات اقبال تہران، گلشن راز جدید، ص ۶۔ ۱۱ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر عبدالشکور احسن، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۷۷ء ص ۴۵۰

۱۲۔ ایران نامہ ص ۲۶۲، اقبال درراہ مولوی، ص ۱۱۵ کلیات اقبال، تہران ار مغان حجاز ص ۴۳۹

۱۳۔ کلیات اقبال، پیام مشرق، ص ۱۹۷

۱۴۔ اقبال کے محبوب صوفیہ، ص ۲۰۷ کلیات اقبال، تہران، ارمغان حجاز ص ۴۴۰

۱۵۔ ایران نامہ ص ۲۴۷ اور ملاحظہ کیجئے اقبال درراہ مولوی ص ۹۸۔۹۹

۱۶۔ مقام شیخ فخر الدین ابراہیم عراقی در تصوف اسلامی۔ ص ۳۶۵۔۳۸۱ (پیروان عشاقنامہ عراقی) اور ملاحظہ کیجئے۔ اینڈو ایرانیکا، ایران سوسائٹی کلکتہ۔ جلد

۱۶ شمارہ، دہ نامہ ہارفارسی بقلم پروفیسر سید حسن۔

۱۷۔ دیوان ہمام تبریزی، بہ تصحیح وکتر رشید عیوضی، تبریز ۱۳۵۱ ش، صحبت نامہ از ص ۲۵۷۔۲۸۱

۱۸۔ مجلّہ روزگار نو، لندن، جلد ۱، شمارہ ۳ زمستان ۱۹۴۱ء ص ۲۸

۱۹۔ سہ حکیم مسلمان ترجمہ فارسی از احمد آرام تبریز ص ۱۵۹۔۱۶۰

۲۰۔ اقبال کے محبوب صوفیہ، پیش لفظ ص و۔ز

۲۱۔ کلیات اقبال، اسرار خودی ص ۲۳۔۲۵۔

۲۲۔ اقبال کے محبوب صوفیہ، پیش لفظ ز۔ط، ص ۵۲۲۔۵۲۳۔

۲۳۔ ملاحظہ کیجئے، دیوان حافظ، بانضمام کشف الغزل و باہتمام حسین پژمان، تہران ۱۳۱۸ حش، مقدمہ ص ۱۱۰۔۱۱۲۔

۲۴۔ ملاحظہ کیجئے۔ ایران نامہ، مضمون اقبال اور غزل بقلم سید اکرم شاہ، ص ۲۵۵۔۲۵۲

۲۵۔ اقبال کے محبوب صوفیہ، ص ۵۱۹

۲۶۔ اقبال نامہ۔۔۔۔۔۔ مجموعہ مکاتیب اقبال، مرتبہ شیخ عطاء اللہ، لاہور، حصہ اول ص ۴۴۔۴۵ اور ملاحظہ کیجئے اقبال اور تصوف از پروفیسر محمد زمان، بزم اقبال، لاہور، طبع سوم مارچ ۱۹۸۴ء، ص ۱۱۲

۲۷۔ اقبال نامہ، حصہ دوم ص ۴۸۔

۲۸۔ اقبال کے محبوب صوفیہ، پیش لفظ ص ع ی۔ک

۲۹۔ کلیات اقبال، اسرار خودی ج۔ ص ۱۱

۳۰۔ اقبال کے محبوب صوفیہ، ص ۵۳۔۵۲۷

۳۱۔ شعر بی دروغ شعر بی نقاب، دکتر عبدالحسین زرین کوب۔ تہران ۱۳۴۶ ش، ص ۱۲۶ اور ملاحظہ کیجئے: کلیات عراقی، عشاقنامہ، ص ۳۴۷۔۳۴۹، عشاقنامہ

عراقی، بتصحیح آر بری، بمبئی ۱۳۵۷ھ ق، ص ۶۲ کہ فصل پنجم بعنوان در کمال انسان در عشق خاص طور پر قابل غور ہے۔

۳۲۔ قرآن حکیم، الرحمان (۵۵) آیہ ۲۹

۳۳۔ اقبال اور تصوف، ص ۴۷

۳۴۔ علامہ اقبال کی یہ تالیف، احیای فکر دینی در اسلام کے نام سے احمد آرام کے فارسی ترجمے کی صورت میں تہران سے ۱۳۴۶ش میں شائع ہو چکی ہے۔

۳۵۔ ملاحظہ کیجئے: مقالات جشن اقبال صدی، مرتبہ پروفیسر محمد منور، شعبہ اقبالیات جامعہ پنجاب لاہور ۱۹۸۲ء

مقالہ: زمان و مکان کی بحث سے متعلق علامہ اقبال کا ایک ماخذ۔۔۔عراقی یا اشنوی؟ ص ۶۱۔۷۲

۳۶۔ مقام شیخ فخر الدین ابراہیم عراقی در تصوف اسلامی، ص ۱۲۷۔۱۳۲۔

۳۷۔ فہرست نسخہ ھای خطی فارسی، مطبوعہ موسسہ فرہنگی منطقہ ئی تہران ۱۳۴۹ش جلد دوم، ۸۲۴۱۔۸۲۵

۳۸۔ علاوہ ازیں رسالے کے مختلف نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ غایۃ الامکان فی درایۃ لاماکن (مقدمہ مصنف ص ۴۔ ایضاح المکنون، ۲۔۱۳۷)

۲۔ غایۃ الامکان فی معرفتہ الزمان والمکان (کشف الظنون، ۲، ۱۱۹۰)

۳۔ غایۃ المکان فی درایۃ الزما (ایران نامہ، ص ۱۸۷ تاثیر معنوی ایران در پاکستان ص ۹۶)

۴۔ رسالتہ الامکنہ والازمنہ (غایۃ الامکان فی درایۃ لامکان، مطبوعہ تہران، دیباچہ ص ز)

۵۔ رسالہ زمان و مکان (مجلّہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ، جلد ۳ شمارہ ۲، ص

۱۰۲)مزید برآں ملاحظہ کیجئے: غایۃ الامکان فی معرفتہ الزمان والمکان، شیخ تاج الدین محمود بن خدا داد اشنوی، صحح ومقدمہ نذر صابری، مجلس نوادرات علمیہ اٹک، کیمبل پور ۱۲ ربیع الاول ۱۴۰۱ھ مقدمہ صفحہ ا کہ اس رسالے کے متعدد نام وہاں درج ہیں۔

۳۹۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۱۵۱۔۱۵۹

۴۰۔ فہرست نسخہ ھای خطی فارسی ہمنزوی، جلد۲، ۸۲۴

۴۱۔ ایران نامہ، درزیل شاہ ہمدان، ص ۱۸۷

۴۲۔ غایۃ الامکان فی معرفتہ الزمان ولمکان، نذر صابری صفحہ الف۔ل

۴۳۔ Thoughts and Reflection of Iqbal C 251

۴۴۔ رسالہ غایت الامکان فی درایۃ المکان، دکتر رحیم بخش فرمنش، ص ۲۲

۴۵۔ رسالہ غایت الامکان فی درایۃ المکان دکتر رحیم بخش فرمنش ص ۱۲

۴۶۔ مقالات جشن اقبال صدی، ص ۷۰۔

۴۷۔ کلیات عراقی، لمعات، ص ۴۰۹

....

علامہ اقبال کی اردو شاعری پر عربی جاہلی ادب کے اثرات

ڈاکٹر سلیم طارق خان

سید نذیر نیازی اپنی کتاب دانائے راز میں رقم طراز ہیں:

''افسوس ہے محمد اقبال کی زندگی کے اس تشکیلی دور کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی اور اس دور کی اہمیت کو بہت کم سمجھا گیا، کچھ سبب بے توجہی، کچھ معلومات کی کمی..... محمد اقبال کی زندگی کے تشکیلی دور کو باعتبار ان کی تعلیم و تربیت اور ذاتی کاوش کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔(۱)

اس ضمن میں عزیز احمد نے لکھا ہے۔

اقبال کا پورا کلام پڑھنے کے بعد اقبال کے اطراف میں بھی بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے۔ رومی، نطشے، برگساں، فشتے، الجیلی، یونانی فلسفہ، جرمن، اطالوی، انگریزی شاعری، فارسی غزل، اردو غزل اور سب کچھ پڑھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ ابھی اور بہت کچھ پڑھنا ہے۔(۲)

اس عبارت کو اپنے مقالے میں درج کرنے کے بعد پروفیسر محمد منور لکھتے ہیں:

''میں سمجھتا ہوں کہ اس ''بہت کچھ'' میں عربی ادب بھی ایک بڑے اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔(۳)

عربی ادب ایک بڑے اہم عنصر کی اہمیت ہی نہیں رکھتا بلکہ اس نے تشکیل اقبال میں ایک کردار بھی ادا کیا ہے۔ اقبال کی زندگی کا مطالعہ اگر ماہ بہ ماہ اور سال بہ سال کیا جائے اور ان تمام ادب کی کتب کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اقبال کی زندگی میں عربی ادب خصوصاً عہد جاہلیت کی عربی شاعری کے

اتنے گہرے اثرات ہیں کہ انہوں نے اردو اور فارسی کی آریائی زمین میں سامی عربی زبان کے علائم و رموز کی اس خوبصورتی سے تخم ریزی اور پیوند کاری کی ہے جو عربی شاعری سے متاثر کسی دوسرے فارسی یا اردو شاعر کے ہاں نظر نہیں آتی۔ اس کا ایک بنیادی سبب ہے کہ اقبال کی تعلیم و تربیت میں عربی زبان کے اساتذہ اور عربی شاعری سے ان کی ہم آہنگی کلیدی اہمیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی تعلیم و تربیت کے بارے میں خود رقم طراز ہیں My education began with the study of Arabic persian (۴) عربی اور فارسی کے اسی تعلم کا نتیجہ تھا کہ عربی اور فارسی ان کے رگ و پے میں رچ بس گئی تھی بلکہ ان زبانوں کے ادب کا اثر تھا کہ عرب کا ثقافتی ورثہ ان کے شعور کا ایک حصہ بن گیا جو ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔ سید نذیر نیازی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ عربی اور فارسی سے محمد اقبال کو دلی لگاؤ تھا۔ فارسی اور عربی ادب ان کے دل و دماغ میں رچ گیا تھا۔ فارسی اور عربی کا ادبی اور ثقافتی ورثہ دل میں گھر کر چکا تھا۔ (۵)

علامہ اقبال کی زندگی کا جائزہ لیں تو اس ثقافتی ورثے کے ان کے دل میں گھر کرنے کے اسباب سامنے آجاتے ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال فرماتے ہیں:

''ہمارے ہاں ابن عربی کی ''فصوص الحکم'' اور ''فتوحات مکیہ'' کا باقاعدہ مطالعہ ہوتا تھا۔ (۶)

علامہ اقبال کے والد ناخواندہ تھے لیکن زیرک اور معاملہ فہم بزرگ تھے۔ اور میر حسن انہیں ان پڑھ فلسفی کہا کرتے تھے۔ انہیں علم و حکمت، شریعت، طریقت، فلسفے اور کلام کے مسائل سے دلی لگاؤ تھا۔ عربی زبان سے ان کی دلچسپی اور دلی لگاؤ کی بہت سی مثالیں ان کی زندگی میں ملتی ہیں۔

علامہ اقبال اور ان کے والد محترم کے مابین مطالعہ قرآن اور نزول قرآن کے

بارے میں ہونے والی گفتگو کو اقبال کے سوانح نگاروں نے قلم بند کیا ہے جس کی طرف اشارہ علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کیا تھا(۷)

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

اسی گفتگو کے دوران علامہ اقبال نے عربی فہم کے بارے میں کہا:

''تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں۔ کچھ سمجھ لیتا ہوں۔(۸)

سید نذیر نیازی اپنی کتاب ''دانائے راز'' میں کسی مقام پر اقبال کی طرف سے کہے گئے اس جملے ''میں نے عربی سیکھ لی تھی'' کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''مطلب یہ ہے کہ جیسی قدرت انہیں انگریزی اور فارسی پر تھی، ویسی عربی زبان پر نہیں۔ لیکن عربی ان کی شاعری میں رچ بس گئی۔ عربی ادب سے انہیں دلی لگاؤ تھا۔ لیکن عربی خواص کی زبان تھی، علم و حکمت کلام اور الہیات تفسیر و حدیث، فقہ و تصوف، عربی میں تحریر و تقریر کے مواقع شاذ ہی آئے۔''(۹)

عربی زبان و ادب کے اثرات کی ہمہ گیری پر سید نذیر نیازی کی ایک اور شہادت ملاحظہ فرمائیے، وہ رقم طراز ہیں:

''یوں بھی ایک ایسے ادب کی تشکیل میں جس سے زندگی کو تحریک ہو، ان کا ذہن عربی ادب کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ طبعی امر تھا کہ فارسی ہو یا اردو، ان کے کلام میں اسلامی ادبیات کے حیات افروز اثرات کا عمل دخل بڑھتا چلا جائے۔ اسرار خودی میں جب حافظ کی تنقید سے ایک غلط تاثر قائم ہوا تو اس کے ازالے کے لیے در حقیقت شعر و ادبیات اسلامیہ کے عنوان سے اپنے خیالات کی وضاحت کرتے ہوئے اے میان کیسہ ات نقد سخن، میں صاف صاف کہا۔

فکر صالح در ادب می بایدت
رجعتے سوئے عرب می بایدت

اقبال کی تشکیل اور تعلیم و تربیت کے حوالے سے جن شخصیات کے اثرات سب سے زیادہ محسوس کیے گئے، ان میں میر حسن کا نام سب سے بلند نظر آتا ہے جو سکاچ مشن کالج میں عربی زبان کے استاد تھے اور جن کے تبحر علمی کے اقبال ہمیشہ معترف رہے۔ ان کیا اعتراف کا خوبصورت ترین انداز یہ تھا کہ جب آپ کو القاب نوازنے کے لیے حکومت نے رابطہ کیا تو آپ نے ایک شرط عائد کی کہ آپ کے استاد میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب دیا، جائے اور جب ان کی تصنیفات کی بابت دریافت کیا گیا تو علامہ اقبال نے خود کو ان کی تصنیف قرار دیا۔

آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم کی غرض سے داخلہ کیا تو ایف ۔اے اور بی ۔اے میں عربی کو بطور مضمون طور پر منتخب فرمایا اور اس مضمون سے طبعی دلچسپی کا یہ عالم کہ ایف اے اور بی اے میں عربی مضمون میں اول آ کر با قاعدہ تمغوں اور اعزازات تعلیمی سے نوازے گئے۔ انہیں جمال الدین اور خلیفہ محمد حسین کے تمغے دیے گئے (۱۲) اس کے علاوہ خان بہادر نانک بخش تمغہ بھی دیا گیا (۱۳) جو عربی زبان میں امتیازی کامیابی کے لیے مخصوص تھا۔ (۱۴)

گورنمنٹ کالج لاہور میں قیام کے دوران آپ عربی کی تعلیم کے لیے اورینٹل کالج میں جن عربی اساتذہ سے استفادہ کرتے تھے۔ ان میں مولوی محمد دین ایم ۔او ۔ایل اور مولانا محمد عبداللہ ٹونکی خاص طور پر معروف ہیں۔ اس زمانے میں مولانا محمد حسین آزاد بھی اورینٹل کالج سے وابستہ تھے لیکن ان سے استفادہ کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہوئیں کیونکہ یہی دور مولانا محمد حسین آزاد کی وحشت ک دور تھا۔ (۱۵)

علامہ اقبال نے ایم ۔اے کیا تو ایف ۔اے اور بی ۔اے میں اول پوزیشن حاصل کرنے کے سبب ان کا تقرر بحیثیت میکلوڈ عربیک ریڈر اورینٹل کالج لاہور میں کیا گیا۔ ان کی تقرری کی تاریخ ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء ہے۔ ان کی ذمہ داریوں میں

دوسرے امور کے علاوہ۔

۱۔ عربی کتب نصاب کی طباعت کی نگرانی (۱۶)

۲۔ عربی، انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ شامل تھا۔ اورا ورینٹل کالج لاہور میں آپ کا قیام تقریباً چار سال تک رہا۔ (۱۷)

عربی زبان و ادب سے آپ کی محبت اوراس میں دسترس کا ثبوت ایک اور واقعے سے بھی ملتا ہے۔ آپ جس دوران گونمنٹ کالج لاہور میں بی اے کے طالبعلم تھے، ان دنوں اورینٹل کالج میں مولانا محمد اقبال عربی کے معلم تھے اس طرح سے یہ اقبال کے بزرگوں میں سے تھے۔ انہوں نے ابوسعید محمد شعیب کا رسالہ مختصر العروض شائع کرنا چاہاتو قطعہ تاریخ کے لئے اقبال سے کہا جس میں یہ خصوصیت رکھی گئی کہ فصاحت، بلاغت، لیاقت اور ذہانت کا دل یعنی الف لے کر چار عدد حاصل کیے۔ پھر مادہ تاریخ کے اعداد ۱۸۸۵ء کے ساتھ ۷ عدد ادب کے شامل کیے۔ اس طرح ۴+۷+۱۸۸۵=ع سنہ مطلوبہ حاصل کیا۔

دکھا کر یہ کتاب بے بہا دل چھین لیتا ہوں
فصاحت کا بلاغت کا لیاقت کا ذہانت کا

ادب کے ساتھ سال طبع پھر یوں عرض کرتا ہوں
جزاک اللہ لکھا ہے رسالہ مختصر کیسا (۱۸)

آپ نے قیام یورپ کے زمانے میں پروفیسر آرنلڈ کی جگہ لندن یونیورسٹی میں عربی زبان کی تدریس کے فرائض بھی سرانجام دیے۔ (۱۹) ان کے دواوین اور اشعار، آیات قرآن، عربی ضرب الامثال، تراکیب، عربی الفاظ محاوروں اور تلمیحات سے پر ہیں (۲۰)

عربی زبان وادب سے علامہ اقبال کے اس متعلق کے اجمالی تعارف کے بعد یہ

ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ انکی فکری جولانگاہ میں عربی زبان و ادب کا عمل دخل کس قدر ہے۔ان کے اشعار میں عربی شاعری کی مداخلت کس قدر ہے۔اس کا اجمالی جائزہ پروفیسر محمد منور کے مقالے بعنوان '' کلام اقبال پر عربی ادب کے اثرات میں مل جاتا ہے۔لیکن اقبال کے فکروفن پر عربی زبان کے اثرات اس سے کہیں زیادہ ہیں جن کا وقت نظر سے جائزہ لینا ضروری ہے۔

عربی ادب جس میں تفسیر وحدیث، فقہ وعلم الکلام ،تصوف فلسفہ اور عمرانیات جیسے بے شمار علوم موجود ہیں، اس کے علاوہ عربی شاعری،تصوف ،فلسفہ اور عمرانیات ، مزید برآں عربی شاعری کی وسیع دنیا بھی ہے۔جس نے فکر اقبال پر بے پناہ اثرات مرتب کیے ہیں۔اس کام کو مرحلہ وار کیا جائے تو مناسب ہے،تاہم اس مقالے میں عہد جاہلیت کے ادب کے اثرات کا جائزہ ہی مقصود ہوگا۔

جاہلی عرب فطرتاً سامی اقوام سے زیادہ شاعری کی قابلیت رکھتے تھے۔اور شاعری پر ان کو پورا پورا عبور حاصل تھا۔ان کیلیے ان کی زبان میں مفہوم ادا کرنے کے لیے بہت زیادہ وسعت موجود ہے۔ان کا ماحول خیال آفرینی کے لیے مناسب وموزوں ہے۔ان کی طبیعتیں پاکیزہ اور زندگیاں سادہ تھیں قوت ،عصبیت اور جزبہ آزادی ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ان کی طبیعتیں پر جوش اور حساس تھیں،خوف اور خوشی کے جذبات ان کو باسانی یاد کر دیتے تھے۔

آسمان اور ریانان کے درمیان وہ ایسی لامحدود فضا میں موجود تھے جو ان کے دل و دماغ کو جلال و جمال اور افکار و خیالات سے معمور کر دیتی تھیں۔ان کے طبائع حساس اور پرجوش ہیں خوف خوشی۔غم وغصہ عیش وعشرت بہت جلد ان کو بے خود اور مست کر دیتے ہیں۔چنانچہ جو خیال ان کے ذہن و دل میں سمایا، جس چیز کا انہیں احساس ہوا۔انہوں نے فوراً اس کو نظم کر دیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری ان کے علم وحکمت وتجارت کا مخزن ہے۔ان کے کردار اور جنگی وقائع کا مرقع ہے جسے ایام

العرب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ان کی شاعری میں برجستگی اور آمد کا وافر حصہ ہے۔اس کی مثال دنیا کی کسی دوسری زبان میں نہیں ملتی۔

عرب بنیادی طور پر خانہ بدوش تھے اور خانہ بدوشانہ زندگی سے محبت کرتے تھے۔اور یہی خانہ بدوشانہ زندگی انہیں پیہم رواں رکھتی تھی۔جس کی طرف ایک اندلسی مستشرق نے اشارہ کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں ساری اسلامی شاعری پر عرب شعرا کے مضامین وافکار کی چھاپ ہے۔عربوں کی زندگی بیشتر سفری تھی۔آج یہاں تو کل وہاں،نت نئے چشموں اور نئی چراگاہوں کی تلاش،چنانچہ ان کی شاعری کا بڑا حصہ چھوڑی ہوئی منزل،بچھڑے دوستوں،دور افتدہ محبوباؤں،گزرجانے والے قافلوں اور بے نشان مسافتوں کی روح اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔

اقبال بھی اسلام تہذیب سے جہاں متاثر ہوئے ہیں،وہاں اس ثقافت کی چھاپ ان کی شاعری پر اس قدر گہری ہے کہ علامہ اقبال خود ایک صحرائی معاشرے کے شاعر نظر آتے ہیں،اور صحرائی زندگی کے مختلف عناصر نے ان کی شاعری میں کلیدی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

شاعری میں علائم و رموز کی اہمیت پر سید عابد علی عابد اپنی کتاب شعر اقبال میں رقم طراز ہیں:

''علامہ اقبال ان شعراء میں سے ہیں جو نہ صرف اپنے کلام کی ادبی خوبیوں کی وجہ سے جاذب توجہ ہیں بلکہ اپنے مطالب و معانی کے اعتبار سے بھی تحقیق کا موضوع بنتے ہیں۔ہر جلیل القدر شاعر روایات کے اس ذخیرے سے استفادہ کرتا ہے جو معنی خیز تلمیحات،استعارات،تشبیہات اور علامات پر مشتمل ہوتا ہے۔اکثر و بیشتر ادبی روایات کے علائم و رموز لکھنے والے اور پڑھنے والے کے درمیان وہ اشتراک ذہنی پیدا کر دیتے ہیں جو افہام و تفہیم اور ابلاغ کے لئے ضروری ہے۔لیکن شاذونادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ کسی شاعر کے ہاں قدیم ادبی روایات کی تمام مصطلحات یا ان کا بڑا

حصہ ایک جدید معنویت اختیار کرتا ہے۔ اس صورت میں پڑھنے والے کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ان علائم و رموز کے جدید معانی سے اپنے آپ کو آگاہ کرے۔

علامہ اقبال کی شاعری میں جاہلی عربی ادب کے علائم و رموز بہت کثرت سے استعمال ہوئے ہیں جن مین قافلہ، کارواں، بانگ رحیل، صحرا، ہجوم، نخیل، کھنڈر، ناقہ، حدی خوانی وغیرہ۔ اس کے علاوہ ان علائم و رموز استعاروں کے استعمال سے قطع نظر انہوں نے اپنی شاعری کو جاہلی شاعری کے اسلوب کے قریب تر کر دیا ہے۔ اور ان کے قطعات، غزلیں اور نظمیں بار ہا اس نظارے کی طرف لیجاتی ہیں جس کے بارے مین وہ کہتے ہیں (۲۲)

''میں لاہور کے ایک ہجوم میں رہتا ہوں مگر زندگی کی تنہائی کی بسر کرتا ہوں۔ مشاغل ضروری سے فاغ ہوا تو قرآن یا عالم تخیل میں قرون اولی کی سیر مگر، خیال کیجیے جس زمامے کا تخیل اس قدر حسین وجمیل اور روح افزا ہے وہ زمانہ خود کیسا ہو گا۔

خوشا وہ عہد کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ روز کہ دیدار عام تھا اس کا

مولانا صلاح الدین کی دنیائے فکر میں صحرا کی نمود ایک ایسے تصور کو جنم دیتی ہے جو اس کی شاعری کی شاہراہ پر ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ یہیں سے اس کا قافلہ شعر وطن کی وادیوں سے نکل کر ملت کے ریگزار میں رواں ہو جاتا ہے۔ (۲۳)

علامہ اقبال کے یہ تمام تصورات و استعارات، علائم و رموز شاعری کے جاہلی اسلوب سے اکتساب کردہ ہیں کیونکہ عہد جاہلیت کا شاعر خانہ بدوش ہے اور انہی اقدار حیات کو سب سے مقدم سمجھتا ہے جو روزمرہ کی تگ و دو۔ سفر و قیام، ناقہ و فرس

، راحلہ و جرس جنگ اور صلح دوستی و دشمنی فخر و غرور سے کشید کی گئی ہیں ۔لہذا جاہلی عربی شاعر اپنے قصیدے کا آغاز محبوبہ کے کھنڈرات پر آہ و بکا اور ان کھنڈرات سے ہم کلام ہونے کی خواہش ، محبوبہ کے کوچ اور جدائی کے منظر سے کرتا ہے ۔ان کھنڈرات میں وہ چشم تصور سے قافلے کے کوچ کے منظر کو دیکھتا ہے ۔پھر اس کے کارواں کی جرس سنائی دیتی ہے اور یہ قافلے صحرا میں گم ہو جاتے ہیں ۔

کبھی یہ قافلے ، کارواں اور قبیلے کہیں پڑاؤ ڈالتے ہیں اور کبھی یہ دور دیس میں نکل جاتے ہیں اس صحرائی زندگی میں ناقہ و فرس ان کے رفیق ، مددگار اور ساتھی ہیں اور صحرا کی وسعتوں میں پائے جانے والے درندے شیر اور چیتے ان کے دشمن ہیں ۔ ان کا سب سے بڑا دشمن وہ رہزن ہے جو وقت سحر ان کے قافلے پر بلائے بے درماں بنکر ٹوٹ پڑتا ہے ۔یہ تمام مناظر ان کی شاعری کا حصہ ہیں ۔صرف ایک یا دو شعر میں قدم نہیں رکھ سکتا لہذا ان کی شاعری کے تمام دواوین اٹھا کر دیکھیے اسی اسلوب سے ان کا آغاز ہوتا ہے ۔اگر چہ کھنڈروں کو شاعری میں متعارف کروانے کا سہرا امرؤالقیس کے سر باندھا جاتا ہے کہ اس نے کہا تھا ؏

”قفانبک من زکری حبیب و منزل“ (۴۴)

(دوستو آؤ حبیب و یار حبیب کی یاد میں رو لیں)

لیکن امرؤالقیس اپنے سے بھی پہلے کے کسی شاعر کا پتہ دیتا ہے کہ کھنڈرات پر رونے کی روایت ابن خزام نے ڈالی تھی اور وہ کہتا ہے ۔

عوجا علی　　الطلل　　القدیم　　لعلنا

نبکی　　الدیار　　کما بکی　　ابن　　خزام

(ترجمہ: قدیم ویران کھنڈروں پر ٹھہرو تا کہ جس طرح اجڑے مقامات پر ابن خزام رویا ، ہم بھی روئیں)

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں اس کو اس طرح بیان کیا ہے ۔

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو

کھٹک سی ہے جو سینے میں غم منزل نہ بن جائے

عہد جاہلیت کا مشہور حکیم و فلسفی شاعر زہیر بن ابی سلمی بھی اسی اسلوب کو اختیار کرتا ہے اور وہ بیس سال بعد محبوبہ کے کھنڈرات سے گزرتا ہے تو انہیں پہچاننے کی تگ و دو کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے

امن ام اوفی دمنتہ لم تکلم
بحومانتہ الدراج فالمتثلم

وقفت بھا من بعد عشرین حجتہ
فلایا فعرف الدار بعد توہم

ترجمہ: کیا یہ ام اوفی کے اجڑے دیار ہیں جو اج ہم کلام نہیں ہوتے ہیں جو حامانتہ الدراج اور متثلم کے ٹیلوں کے درمیان پھیلے ہوئے ہیں

میں یہاں بیس سال کے بعد ٹھہرا ہوں۔ میں نے بہت غور و خوض کے بعد ان کو پہچانا ہے۔

علامہ اقبال نے اس مفہوم کو اپنی نظم پیام خضر میں کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ ع

"تازہ ویرانیکی سودائے محبت کو تلاش"

پھر: ہیر ابن ابی سلمی کہتا ہے۔

بھا العین والا رام یمشین خلفتہ
و اطلل وھا ینھضن من کل مجثم (۲۷)

(وہاں نیل گائیں اور سفید ہرن گھومتے رہتے ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے ان کے بچے ٹھکانے چھوڑ کر رواں دواں ہیں)

علامہ اقبال اپنی نظم میں اس منظر کو اسی بھی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں

''ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پرواخرام''

زہیر بن ابی سلمیٰ کہتے ہیں

''اثافی سفعافی معرس مرحل

و نو یا کجزم الحوض لم یتثلم (۲۸)

(ترجمہ: وہ دیگ پکانے کی جگہ چولہے کی اینٹیں اوراس کی راکھ اورخیموں کے گردکھودی گئی نالی اورکنویں کی منڈیریں جوابھی تک محفوظ ہیں)

علامہ اقبال نے اس کونہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے اوراس کو مقامی سطح سے اٹھارکرافاقی بنادیا ہے۔

آگ بجھی ہوئی ادھر ٹوٹی ہوئی طناب ادھر

کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

امرؤالقیس اپنے قصیدے میں کہتا ہے۔

ویوم دخلت الخذرخد رعنیزہ

فقالت لک الویلات انک مرجلی

نوول وقد مال الغبیط بنا معا

تقول وقد مال الغبیط بنا معا

عقر بعیری یا امر القیس فانزل (۲۹)

ترجمہ: اوروہ روز جب میں عنیزہ کے محمل میں اس کیساتھ ہم نشیں ہواتو اس نے کہاتمہارا ستیاناس تم مجھے ہودج سے اترنے پرمجبورکردوگے اوریہ ہودج ہم دونوں کے بوجھ کے سبب جھکا جاتا ہے اورمیرااونٹ بھی ہمارابوجھ نہیں اٹھاسکتا لہذا اے امراؤالقیس میرے ہودج سے اترجا۔''

علامہ اقبال نے اس خیال کوایک نئی فکری جہت دی ہے۔وہ کہتے ہیں

تو رہ نورد شوق ہے ، منزل نہ کر قبول
لیلی بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

علامہ اقبال کے ہاں صحرائی زندگی کے تمام عناصر پوری جزئیات سمیت ملتے ہیں۔عربی شاعری اور سلوب سے متاثر ہونے کی طرف انہوں نے بار بار ذکر بھی کیا اور عجمی زبانوں کے استعمال کے باوجود ان کی لے عربی ہی رہی۔ اور یہی لے دراصل عربی اسلوب اپنانے کی طرف اشارہ ہے۔وہ کہتے ہیں۔

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

علامہ اقبال کو جاہلی عربی شاعری میں کوچ کے مناظر اس قدر پسند آتے ہیں کہ وہ ملت اسلامیہ کو عرب تہذیب کا ایک قافلہ تصور کرتے ہیں۔اور اپنی شاعری میں تمام تر علائم و رموز وہی استعمال کرتے ہیں جو عرب شاعر اپنے یا محبوب کے قبیلے کی روانگی کے منظر کو بیان کرتے ہوئے کرتا ہے اور پھر اس سے انہیں کسی کمتری کا احساس نہیں ہوتا بلکہ وہ تو اس منظر کے حسن کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

اے رہین خانہ تو نے وہ سماں دیکھا نہیں
گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگ رحیل

علامہ اقبال اس کو یوں بھی بیان کرتے ہیں

فریب خوردہ منزل ہے کارواں ورنہ
زیادہ راحت منزل سے ہے نشاط رحیل

ایک عربی شاعر زہیر کوچ اور سفر کے مناظر بیان کرنے کے بعد اس سفر کی خوبصورتی اور جمال کی لطافت کو اس انداز میں پیش کرتا ہے۔

وفیھن ملھی للطیف و منظر
انیق لعین لناظر المتوسم

نہایت لطیف حسن و دلکشی ہے)

صحرائی زندگی مشکلات وخطرات سے بھرپور زندگی ہوتی ہے جہاں درندے بھی ہیں اور رہزن بھی ۔ اس کے اندر وہاں کا شاعر روز و شب گزارتا ہے ۔ لہذا وہ اپنی شاعری مین ان تمام مناظر کا ذکر کرتا ہے ۔ مثلاً چیتے ، شیر بھیڑیے اور دوسرے درندوں کا تذکرہ کثرت کیساتھ ملتا ہے ۔ انہی کی صدائے بازگشت نئے معانی اور مطالب کے ساتھ علامہ اقبال کی شاعری میں بھی ملتی ہے ۔ جاہلی دور کا ایک شاعر شیر کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے ۔

بطوف بھا من النجار اسد
کا سد الفیل مسکنھا العرین
یظل اللیث فیھا مستکینا
نہ فی کل ملتفت آنین

اس میں بنی نجار کے شیر پھرتے ہیں ۔ ان جنگلی شیروں کے مانند جن کا مسکن گھنی جھاڑی ہے ۔ جس میں شیر ہمیشہ خاموش رہتا ہے اور سننے والا بس اس شخص کی ہائے ہی سنتا ہے جسے وہ پھاڑ ڈالے)

علامہ اقبال فرماتے ہیں ع

اگر ہ جنگ تو شیران غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزال تاتاری

بانگ درا کی ایک غزل میں بھی عرب کے شیروں کا تذکرہ ہے ۔

نکل کر صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

کسی بھی شاعر کے ہاں اس قسم کے تلمیحی تخیل پر طلسماتی اثر ڈالتی ہے ۔ اگر ہم ان بلیغ استعاروں ، علائم اور رموز کو شمار کریں تو علامتوں کا دائرہ نہایت وسیع ہو جائے جو

علامہ اقبال کی شاعری میں عربی شاعری اور تہذیب سے حاصل کی گئی ہیں۔ یہ سب استعارے اور علامتیں اگرچہ مستقل نوعیت اختیار نہیں کرتیں، لیکن ان کی علامتی حیثیت بہرحال مسلم ہے۔

عربی جاہلی شاعری میں رات کا وصف، راتوں کو چلنے والے مسافروں، بھٹکے ہوئے راہیوں کا تذکرہ کثرت سے ملتا ہے۔ صحرا میں مستقل راستوں کے موجود نہ ہونیکی وجہ سے مسافروں کے بھٹکنے کے امکانات بھی بہت زیادہ ہوتے تھے۔ لہذا جاہلی عربوں کے ہاں رواج تھا کہ وہ رات کو آگ روشن کرتے تھے تاکہ بھولے بھٹکے مسافر آگ سے راستہ تلاش کرتے ہوئے اس طرف کا رخ کریں۔

بلوغ الارب کے مصنف محمود شکری۔ آلوسی نے اپنی کتاب میں ایسی بہت سی آگوں کا تذکرہ کیا ہے جو مسافروں کی رہنمائی اور ضیافت کے لیے برسوں تک جلتی رہیں۔ عرب اپنی اس خصوصیت کو فخر کا موضوع بھی بناتے تھے، مثلاً ایک جاہلی عربی شاعر کہتا ہے۔

لعمری لقد لاحت عیون کثیرہ

الی ضوء نار بالیفدع تحرق

ترجمہ: میری عمر کی قسم اس آگ کی روشنی کو بہت سی آنکھوں نے دیکھا جو بلند ٹیلے پر جل رہی تھی۔

امرالقیس بھی محبوبہ کے چہرے کو تاریک الدنیا کے چراغ سے تشبیہ دیتا ہے جو رات کی تاریکی میں بھولے بھٹکے مسافروں کے لیے امید کا پیغام دیتا ہے۔ وہ اپنے مشہور معلقے میں کہتا ہے۔

تضئ الظلام بالعشیۃ کانھا

ستارہ ممسی راہب متبتل (۳۲)

ترجمہ: (محبوبہ ک چہرہ رات کی تاریکی میں کسی راہب متبتل تاریک الدنیا کے

چراغ کی طرح منور ہوتا ہے)

امراؤالقیس ایک اور شعر میں کہتا ہے۔

نظرت الیھا والنجوم کانھا

مصابیح رھبان تشب القفال (۳)

امراؤالقیس کے اس شعر کے دوسرے مصرع کو اقبال نے اپنی نظم ''طلوع اسلام'' کے ساتھ شعر میں خوبصورتی سے اردو قالب دیا ہے۔

گماں آباد ہستی میں یقین مرد مسلماں کا

بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی

یا رات کی تاریکی میں چمکنے والے ان چراغوں سے کس قدر خوبصورتی سے اپنے فکر بلند کی تشبیہ دی ہے وہ کہتے ہیں۔

صفت برق چمکتا ہے مرا فکر بلند

کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمت شب میں راہی

اقبال اپنی نظم ''ایک آرزو'' میں اس تخیل و نہایت سادگی سے اس انداز میں بیان کرتا ہے۔

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم

امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

ظلمت شب ''شب تاریک'' دراصل ایک استعارہ ہے قوم و ملت کی حالت کے لیے جس کو علامہ اقبال کے فکر سے بلند نے ایک چراغ کی صورت نئے نئے راستوں کی نشان دہی کی تا کہ وہ اپنی شب تاریک کو سحر کر سکے۔

جاہلی کی شاعری کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں گھوڑے، اونٹ یا دوسرے جانوروں کا تذکرہ بہت زیادہ ملتا ہے بلکہ اس کی اہمیت کا اندازہ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ امروالقیس کی وجہ شہرت گھوڑے کی توصیف ہے۔اس نے اپنی بیوی کو طلاق

اس لیے دی کہ اس کا فیصلہ تھا کہ علقمہ الفحل ، امراؤالقیس کی نسبت توصیف فرس بڑا شاعر ہے۔ طرجہ۔ عنترہ، کعب بن زہیر اور دوسرے شعراء کے ہاں اونٹ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اور وہ اپنے قصائد میں معتد بہ حصہ اس کی توصیف کے لیے وقف کرتے ہیں۔ یہ جانور صحرائی ماحول میں ان کے رفیق بھی ہیں اور مددگار بھی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس ماحول میں قوت کا استعارہ بھی ہیں۔ اسی لیے ذبیانی جیسے شاعر نے جو عربوں کے شعری مقابلے میں منصف کے فرائض سر انجام دیتا تھا۔ جنگلی بیل کو طاقت کے استعارے کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور عقاب اور شاہین کو بھی وہ طاقت کے استعارے کے طور پر پیش کرتے ہیں بلکہ عقاب کی پھرتی۔ نگہ کی تیزی، اس کی خودداری ان کے ہاں اہمیت اختیار کر جاتی ہے بلکہ توصیف فرس کا مشہور شاعر امراؤالقیس بھی اپنے گھوڑے کو جس اس کے لیے قوت، شوکت، پھرتی اور تیزی کا نشان ہے عقاب سے تشبیہ دیتا ہے۔ وہ اپنے شکار کی منظر کشی اس طرح کرتا ہے۔

نعادیت منہ بین ثور و نعجتہ
وکان عدائی ازا رکبت علی بالی
کانی بفتخاء الجنا حین نقوۃ
علی عجل منھا اطاطی شعلہ لی
تخطف خزان الا نیعم بالضحی
وقد حجرت منھا ثعالب اورال
کان قلوب الطیر رطبا و یابسا
لدی وکرھا العناب الحشف البالی (۳۴)

ترجمہ: میں نے تیزی سے تعاقب کیا اور یکے بعد دیگرے ایک نیل گائے اور ایک جنگلی بیل کو مار گرایا۔ سوار ہونے کے بعد گھوڑے کو دوڑاتے میں بہت ہوشیاری

سے کام لے رہا تھا۔ جب میں اپنے تیز گھوڑے کو ایڑ لگا رہا تھا تو ایسا نظر آتا تھا کہ میں ایک پھرتیلے، بازو موڑ کر جھپٹنے والے عقاب پر سوار ہوں جو بوقت چاشت، انیم (مقام) کی لومڑیاں بھٹوں میں گھس گئی ہوں۔ اس عقاب کے اردگرد پرندوں کے تازہ اور خشک دل اس طرح پڑے ہوئے ہیں جیسے عناب اور ردی کھجوریں)

خنساء بھی اپنے بھائیوں کو عقاب کی جوڑی سے تشبیہ دیتی ہے۔ امراؤالقیس اپنے معلقے مے گھوڑے کا وصف اس طرح پیش کرتا ہے۔

مکر مفر مقبل مدبر معا

کجلمود صخر حطہ السیل من عل

اس شعر کے پہلے مصرع کو علامہ اقبال نیا س طرح اردو کا قالب دیا ہے۔ کہ عربی اور اردو مصرعوں میں صوتی ہم آہنگی آ گئی ہے۔ وہ شاہین کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں

جھپٹنا۔ پلٹنا ، پلٹ کر جھپٹنا

لہو گرم رکھنے کا ہے ایک بہانہ

اور شعر کے دوسرے مصرع کو انہوں نے اپنی نظم، ساقی نامہ میں اس خوبصورتی سے جذب کیا ہے کہ منظر کشی کا حق ادا ہو گیا ہے۔

امراؤالقیس نے تو اس کو اس طرح ادا کیا کہ یہ گھوڑا ایک ایسی چٹان ہے جسے سیلاب نے اوپر، بلندی سے نیچے لڑھکا دیا ہو، لیکن اس چٹان کے لڑھکنے کے منظر کو علامہ اقبال نے زیادہ خوبصورتی دے دی ہے۔ وہ ندی کے بارے میں کہتے ہیں۔

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی اٹکتی ، لچکتی سرکتی ہوئی

اچھلتی ، پھسلتی ، سنبھلتی ہوئی ، بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

علامہ اقبال کے ہاں عقاب، شاہین اور شہباز نے وہ علامتی حیثیت حاصل کی ہے جو عرب شعرا کے ہاں دوسرے جانوروں کی ہے۔ وہ شاہین کے وصف

میں عرب شعرا سے اکتساب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ان کے ہاں علو معانی اور وسعت تخیل جاہلی شعرا سے کہیں زیادہ اور بہتر ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری میں قوت اور ضربت کاری کا تصور بہت نمایاں ہے۔ ان کی نظر میں وہی جوان قبیلے کی آنکھ کا تارا ہے جس کے کردار کی بلندی کیساتھ ساتھ اس کی ضرب بھی کاری ہے۔ اقبال نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی، وہ اس تہذیب کے زیر نگین تھا۔ جس کی بنیاد "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" پر استوار کی گئی تھی۔ اور یہ اس کی جاہلیت جدیدہ تھی۔۔ قبل اسلام کا جاہلی معاشرہ بھی انہی اصولوں پر استوار تھا۔ علامہ اقبال مرحوم کی زندگی میں ایک جنگ عظیم مسلمانوں کی خلافت کو پارہ پارہ کرنے پر منتج ہوئی اور ترکی کا یہ مرد بیمار آخر خاک وخون میں غلطاں ہو کر دم توڑ گیا اور مسلم ملی تشخص پھر سے کسی مسیحا کا متلاشی ہو گیا۔ اقبال نے ایک ایسے مسیحا کا روپ دھارا جو نوجوانوں کے اندر عقابی روح بیدار کر کے، اور اس کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا کر کے، ممولے کو شہباز سے لڑا دینے پر آمادہ ہو اور وہ ذلت و پستی کی اس اندھیری رات میں چیتے کی آنکھ کے چراغ سے نئی عزت و شرف کی صبح کا سراغ حاصل کرنے پر اپنی تمام تر توانیاں صرف کر دینے میں مصروف عمل ہو اور باطل تہذیب کو صداقت آشنا کرنے کے لیے اپنے پیکر خاکی میں جان پیدا کرنا اپنا مقصود جانے۔ علامہ اقبال اسی لیے عصا کے بغیر کلیمی کو کار بے بنیاد جانتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے۔ کہ علامہ اقبال کی شاعری کا ثقافتی پس منظر صحرائی عربی معاشرے سے اجاگر ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ اس صورت حال کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے صحرائی معاشرے کے استعارے اور علائم و رموز استعمال کرتے ہیں

عہد جاہلیت کے عربوں کی شاعری خانہ جنگی کی پیداوار ہے۔ فخر حماسہ اور غرور اس کی شاعری کی جان ہے، ہجو یہ اشعار سے اپنے مدمقابل کو ذلیل وخوار کرنے کے

لیے پورا زور صرف کر دیتے ہیں۔ عزت وشرف اور طاقت وقوت ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں اور ہر دم آمادہ پیکار رہنا ہی زندگی کی بقا کا ضامن ہوسکتی ہے۔ عہد جاہلیت کا مشہور شاعر زہیر بن ابی سلمی کہتا ہے،

من لم یزد عن حوضہ بسلاحہ

یھدم و ہمن لا یظلم الناس یظلم (۳۶)

ترجمہ: (جو حوض کی حفاظت اپنے ہتھیاروں سے نہیں کرسکتا اس کے حوض کو تباہ کردیا جاتا ہے اور جو لوگوں پر ظلم نہیں کرتا اس پر ظلم کیا جاتا ہے)

طاقت وقوت کا حصول ہی ان کا مطمح نظر ہے اور یہی قوت ان کی بقا کی ضامن ہے۔ یہی ان کے فخر وغرور کی بنیاد ہے اور تلوار کی ضرب ہی ان کی قوت کا اظہار ہے۔ عہد جاہلیت کے ایک شاعر بلعاء بن قیس الکنانی کیا اشعار کو ابوتمام نے اپنے مرتب کردہ دیوان حماسہ میں انتخاب کیا ہے،

وہ فارس فی غمار الموت منغمس

اذا تالی علی مکروتہ صدقا

غشیتہ و ھو جی جلوا باسلہ

عضا اصاب سلواء الراس فالفلقا

بضربتہ لم تکن منی مخالستہ

ولا تعجلتھا جبنا ولا فرقا (۳۷)

ترجمہ: (بہت سے موت کی سختیوں میں ڈوب جانے والے ایسے سوار ہیں کہ جب ناپسندیدہ چیز کی بھی قسم کھالیں تو پوری کرتے ہیں۔ جب وہ سبز رنگ کے بہادر لشکر کے درمیان گھرا ہوا تھا تو میں نے اس کو ایسی قاطع تلوار کے ساتھ ڈھانپ دیا جو سرے کے درمیان لگی ہوئی تھی اور اس کا سر پاش پاش ہوگیا۔ وہ ایسی ضرب تھی جو مجھ سے نہ تو گھبراہٹ میں سرزد ہوئی تھی اور نہ میں نے اس کو بزدلی اور خوف کی وجہ

سے جلدی میں مارتھا۔

بہادری اور شجاعت اور دشمن پر حملے کے ضمن میں اس سے بہتر نقطہ نظر پیش نہیں کیا جاسکتا اور یہی بات کسی بہادر فرد کے لیے سرمایہ افتخار ہو سکتی ہے۔ طاقت اور ضر بت کاری کا یہ تصور علامہ اقبال کے ہاں پہنچتا ہے جو اسلامی تہذیب و تمدن اور اس کی اخلاقیات کے داعی ہیں تو اس میں جوہری فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ تبدیلی ایسی مثبت تبدیلی ہے جس کا معاشرے کی بنیادی اقدار سے گہرا تعلق ہے۔ ان کیہاں نسبت و ملک و ملت سے زیادہ حق و صداقت اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔ اور وہ جس تہذیب کے داعی ہیں، اس کی بنیاد بھی صداقت ہے۔ اور وہ کردار کی انہی خوبیوں کو قیادت کی اساس قرار دیتے ہیں۔ مثلاً ان کا یہ فرمانا۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا امانت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اس لیے ان کے ہاں قوت اور طاقت کا تصور صداقت سے مشروط ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

ہو صداقت کے لیے جس دل مرنیکی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جان پیدا کرے

یا ان کے ہاں اس کا ایک اور واضح تصور پایا جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر
شبستان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

ان کے نزدیک یہ کارگہ حیات پنجہ نصاری اور یہود و ہنود میں آ کر رزم گاہ بن چکی ہے جس میں ایک حریف قوت کی حیثیت سے مسلم نوجوان کو اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام
میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے جنگ

اور پھر اسی کار گہ حیات اور رزم گہ حق و باطل کے اندر وہی سرور آتا ہے جو کسی عرب کو اپنے مخالف اور حریف کے مقابلے میں میدان جنگ میں اترتے وے محسوس ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

سرور جو حق و باطل کی کارزار میں ہے
تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے

ان کے نزدیک وہ وسیع دنیا مسابقت کی دنیا ہے اور جو قوم اس مسابقت کی دمادم سے نا آشنا رہتی ہے۔ نیست و نابود ہو جاتی ہے لہذا ہر ہنر میں مسابقت کا جزبہ ہی قوموں کو زندہ باشعور اقوام کی صف میں کھڑا کر سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

اس کے علاوہ اگر وقت نظر سے علامہ اقبال کی شاعری کا جاہلی عربی شاعری سے باقاعدہ، موازنہ کیا جائے ے اسی تنقیدی نظر سے عربی ادب کو دیکھا جائے جس سے علامہ اقبال کی شاعری کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو کئی کئی اشعار جاہلی قوت وشوکت کے احساس کی ترجمانی کرتے ہوئے ملیں گے۔ اس جوہری فرق کے ساتھ جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اور یہی فرق علامہ اقبال کے فن کو معراج تک پہنچا دیتا ہے۔

ایک عربی شاعر جعفر بن علیہ الحارثی کہتا ہے۔

لا یکشف الغماء الا ابن حرۃ
یری غمرات الموت ثم یزروھا

(لڑائی کی مصیبت سے اس آزاد اور شریف ماں کے بیٹے کو کوئی دور نہیں کرسکتا۔

وہ موت کی سختیوں کو دیکھتا ہے اور دیوانہ وار ان میں گھس جاتا ہے)

علامہ اقبال نے اس تخیل کو کس حسن سے بیان کیا ہے

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں

وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

عہد جاہلیت کا مشہور صعلوک شاعر طابط قرا اپنے چچا زاد بھائی کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ وہ کہتا ہے۔

اذا حاص عینیہ کری النوم لم یزل

لہ کالی من قلب شیحان جا تک

یری الوحشتہ الانس الانیس ویھتدی

بحیث اھتزت ام النجوم الشوابک

ترجمہ: (جب نینداس کی آنکھوں کو سی دیتی ہے تو اس کا دل بیدار رہتا ہے، اور بہادر دل اس کو خطروں سے باخبر رکھتا ہے۔ وہ جنگلوں کے دور دراز مقامات کو اپنی وحشت کا انس انیس بنتا ہے اور تاروں کی کہکشاؤں میں اپنا راستہ بناتا)

علامہ اقبال نے اس کو اس سے زیادہ خوبصورت انداز عطا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

سوئے گردوں نالہ شب گیر کا بھیجے سفیر

رات کے تاروں میں اپنے راز داں پیدا کرے

علامہ اقبال کی شاعری میں اہم موضوع آزادی، مرد حر اور غلام یا غلامی کا ہے۔ معاشرہ منظم ہو یا انتشار زدہ، مہذب ہو یا جاہل معاشرہ، زمانہ قدیم ہی سے انسانوں میں انسانوں کو غلام بنا لینے کا تصور موجود ہے۔ جنگوں میں قید کیے گئے مرد، عورتیں اور بچے لونڈی اور غلامی کی صورت اختیار کر لیتے تھے یا بچوں کو اغوا کر کے انہیں انسانوں کی منڈی میں بیچ دیا جاتا تھا اور پھر غلامی کا یہ طوق نسل در نسل چلتا تھا۔ ظہور

اسلام سے قبل کوئی معاشرہ اس لعنت سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا اور یہ غلام صدیوں کے ظلم و ستم سہتے سہتے ضمیر کی دولت سے محروم ہو جاتے تھے۔ ان کی بصیرت ان کو صرف غلامی اور اطاعت کا سبق سکھا سکتی تھی۔ کمزوروں کے لیے اطاعت ہی ان کے فلسفہ حیات کا جزو بن جاتی تھی۔ انکو انسانی حقوق حاصل تھے۔ نہ سیاسی۔ ان کی حیثیت منقولہ جائداد سے زیادہ نہ تھی اور دلچسپ بات ہے کہ غلام کا بیٹا بھی آزاد پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس کی قسمت میں بھی صرف غلامی لکھی جاتی تھی۔ اس شاہین کی نظر اب خفاش کی سیرت اختیار کر گئی تھی۔ اسلام نے ان غلاموں کو جسمانی و سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی غلامی سے بھی نجات دی۔ عربوں کے عہد کی شاعری میں عبد اور حر کا فرق اس قدر شدت سے بیان ہوا ہے کہ حر اور حرہ، عز و شرف کے مترادف ہو گئے اور عبد کا لفظ ذلت، پستی اور رسوائی کی علامت بن گیا تھا۔

علامہ اقبال نے اسکی طرف اشارہ کیا ع۔

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

علامہ اقبال نے اپنے عہد کو دیکھا تو وہاں انہیں حر اور عبد کا فرق بڑا واضح نظر آیا۔ اور ان کی نظر اقوام کے نگار خانہ سیاست کی طرف چلی جاتی ہے۔ جہاں استحصالی قوتوں نے نوع انسانی کو بحیثیت مجموع اپنا غلام اور مطیع و فرمانبردار بنانے کے لیے نئے نئے ہنر ایجاد کیے۔ لہذا علامہ اقبال کو دور جدید، آزاد اور غلام کی تفریق کے ساتھ جاہلی معاشرے سے ممتاز نظر نہیں آتا۔ وہ قومی سطح پر آزادی کے حرمت کا پرچم بلند کر کے ذہنی غلامی سے نجات کی طرف خصوصی توجہ دیتے ہیں اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اس کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا کرنے کے لیے حر اور غلام کے فرق کو میں شدت سے بیان کرتے ہیں کہ عہد جاہلیت کے ان استعارات کو اقبال کی شاعری میں علامت کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ علامہ

اقبال نے جاہلی عہد کیا ان علائم و رموز و استعارات کو کہیں زیادہ وسعت معانی عطا کی ہے۔علامہ مرحوم کے ان علائم و رموز کے صحیح ادراک لے لیے عربی ادب کا سہارا لینے کی ضرورت ہے جس سے انکو اکتساب کیا گیا، اور ان تمام علائم و رموز کو سمجھنے میں عربی ادب خصوصی اہمیت کا حامل رہے گا۔ جب تک نقاد عربی ادب سے استفادے کے بغیر کلام اقبال کی گرہ کشائی کرے گا، اسے وہ شاہین کا فوری حاصل نہیں ہوگا جوان کے فکری جولان گاہ میں محو پرواز ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سید نزیر نیازی، دانائے رازص ۱۰۱

۲۔ رفیع الدین ہاشمی (مرتب) اقبال بحیثیت شاعر (مجلس ترقی ادب لاہور)ص ۲۵۱

۳۔ ایضاً۔

۴۔ سید نزیر نیازی، اقبال کے حضورص ۱۵۔

۵۔ سید نزیر نیازی، دانائے رازص ۸۷

۶۔ انوار اقبال (اقبال اکامی کراچی)ص ۱۷۸

۷۔ سید نذیر نیازی، اقبال کے حضورص ۶۰، ۶۱

۸۔ ایضاً

۹۔ دانائے راز ص ۱۹

۱۰۔ دانائے راز حاشیہ ص ۱۴

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ ایضاً ص ۱۱۲

۱۳۔ ایضاً

۱۴۔ حسب قرارداد پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ ۱۸۹۱ء

۱۵۔ دانائے راز ۱۲۷

۱۶۔ ایضاً ص ۱۲۹، ۱۳۰

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ ایضاً ص ۳۱۵

۱۹۔ ایضاً ص ۱۸

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ سید عابد علی، شعر اقبال

۲۲۔ دانائے راز

۲۳۔ اقبال بحیثیت شاعر ص ۳۲۴

۲۴۔ الل علم الشنتمری، اشعار شعراء الستۃ الجاہلین ص ۲۹

۲۵۔ ایضاً ص ۹۴

۲۶۔ ایضاً۔ ص ۲۷۹

۲۷۔ ایضاً ص ۲۷۹

۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ ایضاً ص ۹۵

۳۰۔ ایضاً ص ۲۸۰

۳۱۔ دیوان الحماسہ مرتبہ ابو تمام (مکتبہ المعارف العلمیہ لاہور)

۳۲۔ اشعار شعراء الستۃ الجاہلین ص ۳۵

۳۳۔ ایضاً ص ۴۷

۳۴۔ ایضاً ص ۵۲

۳۵۔ ایضا ص ۳۶

۳۶۔ ایضاً ص ۲۸۶

۳۷۔ دیوان الحماسہ ص ۲۳

۳۸۔ ایضاً ص ۲۱

۳۹۔ ایضاً ص ۲۹

ایران کے جمہوری و اسلامی انقلابی دور میں اقبال شناسی

پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض

ایران میں عظیم جمہوری اسلامی انقلاب فروری ۱۹۷۹ء میں برپا ہوا۔ اس سے قبال میں دو میعاروں کے دوران سات برس سے زیادہ عرصے تک اس ملک میں مقیم رہا۔ آپ و دانہ کی کشش دیکھیں کہ اکتوبر ۱۹۹۱ء کے اواخر تک بالترتیب علامہ اقبال (مارچ ۱۹۸۶ء) خواجہ حافظ (نومبر ۱۹۸۸ء) حکیم فردوسی (دسمبر ۱۹۹۰ء) اور خواجو کرمانی (اکتوبر ۱۹۹۰ء) کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرنے کے سلسلے میں ہفتے یا دو ہفتے تک یہاں رہنے اور تبادلہ خیال کرنے کے مزید مواقع ملے۔ اس دوران ایران کے جمہوری اسلامی دور کا اقبالیاتی ادب ہی دستیاب نہ ہوا بلکہ کتب اقبال شناسی کے اکثر مصنفین اور مترجمین سے شناسائی ہوئی اور ان میں سے بعض کے ساتھ مفید مکاتبت بھی جاری ہے۔ فارسی ادب کے نئے رجحانات جاننے کے علاوہ ایران میں مطالعہ اقبال کی پیشرفت سے آگاہی میری خاص دلچسپیاں رہی ہیں۔ اس ضمن میں علامہ اقبال کے بارے میں لکھی جانے والی کتب، ان کے کلام کی تدوین و توضیح، منتخبات کلام کی اشاعت اور بعض کتب اقبالیات کے فارسی تراجم وغیرہ کی کیفیت سے قارئین کرام کو اجمالاً آشنا کرنا میرا ایک خوشگوار فریضہ تھا جو اس تحریر کے ذریعے ادا کر رہا ہوں۔

۱۔ نوای شاعر فردا (تدوین و تحشیہ مثنویہای اسرار و رموز) مرتبہ ڈاکٹر محمد حسین مشائخ فریدنی مرحوم:

مثنوی اسرار خودی اور مثنوی رموز بیخودی کے متون کے تحشیہ پر مبنی مندرجہ بالا

عنوان کی کتاب ۱۳۵۸ھ ش ۱۹۷۹ء میں ۳ ہزار نسخوں کی تعداد میں ایران کے اسلامی جمہوری انقلاب کے اوائل میں عمدی کاغذ پر مجلد شائع ہوئی (شائع کردہ بنیاد فرہنگ ایران، تہران، بڑی تقطیع ۲۵۰ صفحات) اسے ڈاکٹر محمد حسین فریدنی مرحوم (متوفی ۵ دسمبر ۱۹۹۰ء) نے مرتب کر کے شائع کروایا تھا۔ مرحوم مصنف کو پاکستان کے اہل علم بخوبی جانتے ہیں۔ وہ کوئی دو دہائیوں تک پاکستان میں ایران کے کلچرل اتاشی اور پھر سفیر رہے (۱۹۵۸ء تا ۱۹۷۷ء)۔ ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ شاہ جہاں میں ایران و برصغیر کے روابط کے بارے میں ہے جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ (تہران یونیورسٹی)۔ وہ اعلیٰ پائے کے عربی دان تھے۔ مجھے استاد بدیع الزمان فروزانفر (م ۱۹۷۰ء) کی زبانی ان کی عربی دانی کی توصیف سن کر تعجب ہوتا تھا۔ وہ موضوعات اقبال کے مداح تھے۔ سعودی عرب اور عراق وغیرہ میں اپنی سفارت کے دوران انہوں نے بڑے اہتمام سے یوم اقبال منعقد کروائے اور یہاں پاکستان میں بھی۔ پاکستان کے مختلف مکاتب فکر کے زعماء سے ان کے دوستانہ روابط تھے۔ پنجاب یونیورسٹی نے انہیں قانون میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی تھی۔ رقم بھی ان کا نیازمند رہا اور "نوای شاعر فردا" کا ایک نسخہ انہوں نے مارچ ۱۹۸۶ء میں اسے تہران میں دیا تھا۔ ڈاکٹر فریدنی کراچی سے بمبئی جاتے ہوئے سکتہ قلبی سے فوت ہوئے تھے۔

"نوای شاعر فردا" کے آغاز میں ناشر ادارے کا ایک تعارفی نوٹ ہے اور بعد ازاں مرتب کا علامہ اقبال کے احوال و آثار و افکار پر مشتمل تفصیلی مقدمہ (۹۸ صفحے)۔ بقیہ ۱۵۶ صفحوں میں مثنویوں کا متن ہے۔ مصنف نے متن پر مفید لغوی اور توضیحی حواشی لکھے ہیں۔ کتاب میں چند تسامحات اصلاح طلب ہیں، مثلاً پاکستان کے قیام کی تاریخ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بجائے ۱۹۵۸ء مرقوم ہے۔ ایسا مغالطہ ہجری شمسی سنہ کو عیسوی سال میں بدلنے سے واقع ہوا۔ اس طرح چند تاریخی اور معنوی زلات

بھی ملتی ہیں ۔ اکتوبر ،نومبر ۱۹۳۳ء میں علامہ اقبال اوران کے ہمراہ ثقافتی وفد کے افغانستان جانے کے سلسلے میں مولف نے لکھا ہے کہ یہ ظاہر شاہ کی دعوت پر گئے تھے، حالانکہ یہ دعوت سفر نادر شاہ افغان نے دی تھی، (۱) اورظاہر شاہ کا دوراقتدار ان کے والد کی شہادت کی تاریخ ۹ نومبر ۱۹۳۳ء سے شروع ہوا (کتاب مذکورصفحہ ۴۵)۔اسی طرح کتاب ''بانگ درا'' پرمولف نے عجیب تبصرہ کیا ہے کہ اس میں مسلم قومیت کے بارے میں کچھ نہیں ملتا (صفحہ ۵۲) حالانکہ علامہ مرحوم کے کئی اشعاراور متعدد نظمیں اس موضوع کی حامل ہیں۔ان معدودے چند باتوں کی اصلاح کے بعد یہ کتاب اگر پاکستان میں شائع ہوکر ہمارے ہاں کے فاضل فارسی یا ایم ۔اے کے نصاب کا جزو بنے تو فارسی ادب کا بھی فائدہ ہواوراقبال شناسی کی مساعی بھی توسعہ پذیر ہوں ۔

اقبال ان لوگوں میں شامل ہیں جن کے بارے میں ایران کے جمہوری اسلامی انقلاب کے داعی سراپا سپاس رہے ہیں۔ وہ اپنے انقلاب کو منجملہ دوسرے عوامل، ان کی فکر کا مرہون منت مانتے ہیں ۔اس حوالے سے جمہوری اسلامی انقلاب کے آغاز میں شائع ہونے والی اس کتاب کے تعارف ناشر کے ایک اقتباس کا ترجمہ پیش کررہاہوں:

''تیرہویں صدی ہجری کے آخری سال برِاعظم ایشیا اورمشرق وسطی کے مسلمانوں کے لئے بہت بلاخیز اورمصیبت انگیز رہے ۔ان منحوس سالوں کے دوران یورپی استعمار اپنے تمام شیطانی تجربوں کیساتھ کامیاب ہوگیا کہ ملت اسلامیہ میں تفرقہ انگیزی کرے، مسلمانوں کی ثقافتی اور معاشی آزادی کو چھین لے، تعلیم وتربیت کی وہ راہ جو دین اورعظمت انسانی پر استوار تھی، وہ ان کے لیے بند کردے اورمجموعی طورپر عالم اسلام کو مغرب کا غلام اورفریفتہ کرے ۔پھر مسلمانوں کی قومی غیرت کو ختم کردے اوران کے دین اوران کی تاریخ کو ان کی نظر میں حقیر بنادے ۔انہی سالوں

کے دوران استعمار کے ہاتھ کٹھ پتلی بنے ہوئے ملوک، امرا، اعیان اور دینی راہنما کھلم کھلا ضمیر فروشی کرتے رہے اور اس پورے منطقے میں مغربی استعمار کا ڈنکا بجانے لگے اور مغربیوں کے مفاد کے کام کرنے لگے۔ استعمار پذیروں نے نئے دینی عقائد اور جدید مذاہب تراشے اور غیروں کے اشارے پر ایک دوسرے سے الجھ پڑے۔ اس طرح سامراجیوں نے سرزمین مشرق سے امن و صلح کی نعمت چھین لی اور مسلمانوں کو بالخصوص اپنا غلام اور دست نگر بنا ڈالا۔

ظلم اور استبداد کے جوئے کے بوجھ نے چودھویں صدی ہجری کے اوائل سے مسلمانوں کی قوت اور حکمت عملی کو اور بھی فشار زدہ اور زبوں بنا دیا۔ اس وقت روشن خیال مسلمان صورت حال کی بہتری لے لیے اٹھے۔ یہ کام اس لیے ضروری تھا کہ مغربی افکار تسلسل سے مشرق میں پہنچ رہے تھے اور چھاپے خانے کی سہولت کی وجہ سے انقلابی فکر کے حامل مقالے اور شعر نوجوانوں کے ہاتھوں میں پہنچ رہے تھے۔ اس وقت مشرق میں سیاسی جماعتیں بنیں اور عام سیاسی بیداری کی خاطر مجلّے شائع ہونے لگے جن میں آزادی خواہ اور بیدار ساز مطالب شامل تھے۔ مغربی ادب بھی مشرقی زبانوں میں منتقل ہونے لگا۔ اس ادب میں سائنسی اور ٹیکنیکی ترقی کے مطالب بھی ملنے لگے۔ اس طرح مشرق میں قومی ترقی اور عام بیداری کا ایک پر ہیجان رجحان ابھرنے لگا۔ برصغیر ہند، قلمرو عثمانی اور ایران میں اس وقت قومیت کے رجحانات ابھرنے لگے۔

برصغیر ہند کے مسلمانوں نے موجودہ صدی کے اوائل میں آزادی خواہی کی صدا بلند کی۔ ان انقلابی رہبروں اور فکری راہنماؤں میں سیالکوٹ میں متولد ایک نوجوان شیخ محمد اقبال شامل تھا۔ یہی اقبال اس صدی کے معروف ترین مسلمان متفکرین کے ایک فرد بنے اور اپنے عصر کے فارسی گوشعراء میں سب سے آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے اپنے ہم وطنوں کی کئی صدیوں کے خواب غفلت سے بیدار کرنے

اوران کی غلامی کی زنجیریں توڑ ڈالنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ انہوں نے یہاں کے مسلمانوں کو متحد کرنے کی سعی کی اور ایک مستحکم اسلامی حکومت (پاکستان) کی تشکیل کی خاطر فکری اساس فراہم کی۔ مسلمان اس خطے میں پسماندہ اور مضمحل تھے۔ پیغام اقبال نے ان کے اضمحلال کی عظمت شرف اور شکوہ سے بدل ڈالا۔

اقبال نے مسلمانوں کی ژولیدگی کی بڑی وجہ ان کے ایمان وایقان کی کمزوری اور اسلامی تعلیمات کے میزان کے برعکس ان کی شخصیت اور خودی کا ضعف بتایا۔ انہوں نے بتایا کہ مغرب کے تمدن سے خیرہ ہونے اور اس کے سراب کو آب سمجھنے اور باہم فرقہ انگیزی اور اسلامی عالمگیر اخوت کی بجائے وطن پرستانہ قومیت اپنانے سے مسلمان کمزور ہو رہے ہیں۔ انہوں نے ہر طرح کی کوشش کی کہ مسلمان اسلام شناس بنیں اور اسلامی معاشرہ وحدت اور خودشناسی کا مظہر ہو۔ اقبال کی غلامی کے نقائص واضح کیے اور مسلمانوں کے سامنے آزادی اور استقلال والی زندگی کا خوش نما منظر پیش کیا۔

اپنے اکثر افکار اقبال نے فارسی زبان کی اپنی شاعری میں پیش کیے۔ یہ زبان صدیوں تک برصغیر کی عمومی زبان رہی۔ اقبال نے اس میں اپنے اعلیٰ وارفع فلسفیانہ اور انقلابی افکار نظم کیے۔ یوں اس صدی میں مثنوی، غزل، دوبیتی اور قطعے وغیرہ کے عالمی شاہکاروں والے مجموعے منصہ شہود پر آئے۔ اس طرح اقبال، ایران اور برصغیر میں نوتشکیل پذیر اسلامی حکومت (پاکستان) کے ان ثقافتی، دینی اور سیاسی روابط کی بنیاد پہلے سے رکھنے کے پیش تاز بنے جو آج روز افزوں ہیں اور دونوں ہم جوار مسلم حکومتیں ان تعلقات کے اثمار سے بہرہ مند ہو رہی ہیں۔ اقبال عارفانہ افکار کے بیان کرنے میں مولانا جلال الدین رومی کے معنوی مرید بنے اور ان کی مثنوی کی ایک طرح سے انہوں نے عصری شرح لکھی۔ اقبال اس ابدی مثنوی کے اسلوب کے پیرو ہیں۔ غزل میں انہوں نے زیادہ تر خواجہ حافظ کے سبک کو سامنے

رکھا اور دو بیتی میں اسلوب بابا طاہر عریاں ہمدانی کو۔ میدان سیاست میں وہ اسلام کے مستقبل کی خاطر ایران کو خاص اہمیت دیتے رہے۔ اقبال کا خیال تھا کہ تہران، ایشیائی ممالک کے مسائل حل کرنے کے ضمن میں ایک مرکز قرار پائے تا کہ مشرق بہتر احوال و اوضاع کا حامل بنے۔ اقبال کے معاصر دور میں البتہ ایران، اسلام سے دور ہو رہا تھا اور مغربی تمدن کی اندھی تقلید پر نازاں تھا۔ اس وقت آپ نے پیش گوئی کی تھی کہ اس سرزمین سے کوئی مرد حق اٹھے گا جو غلامان کی تقلید کی زنجیر کو توڑ کے انہیں مستقبل کی حریت دے گا اور مسلمانوں کی ملی عزت و آبرو کو لوٹائے گا۔

می رس مردی کہ زنجیر غلاماں بشکند

دیدہ ام از روزن دیوار زندان شما

''پیش گفتار ناشر'' کے بعد مثنویوں کے مرتب اور محشی کا تعارف ہے۔ ''تحقیقی در احوال و افدار و آثار اقبال۔'' کتاب دانشگاہ پنجاب لاہور کے نام معنون ہے۔ مولف و موضح نے ذیل کے عنوانات پر لکھ کر کتاب ۹۸ صفحات پر مملو کی ہے: ٴ

اقبال اور پاکستان ایک نظر میں، لاہور مدنیت ایران کا گہوارہ، عصر اقبال کے لاہور کا فکری اور معاشرتی دور نما، کوکب اقبال کی نمود، اقبال کے والدین اور علامہ کی ابتدائی تعلیم و تربیت (از دبستان در سیالکوٹ یا دانشگاہ پنجاب در لاہور) آغاز شہرت، سفر یورپ، وطن میں مراجعت، عملی سیاست، شمع حیات کا خاتمہ، حیات اقبال کی ایک تقویم، تصانیف، علم الاقتصاد، ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقاء، درسی کتاب تاریخ ہند۔ اسرار خودی، رموز بیخودی، پیام مشرق، بانگ درا، زبور عجم مع دو مثنوی، جاوید نامہ۔ خطبات تشکیل جدید تفکر اسلامی، مسافر، بال جبریل، پس چہ باید کرد، ضرب کلیم، ارمغان حجاز اردو اور انگریزی مقالات۔

اقبال ایک معمار حرم، اتحاد مسلمین کا داعی۔ خلافت الٰہی کا نقیب، اقبال اور مثنوی رومی بحوالہ برصغیر میں مثنوی کی مقبولیت، اقبال مصور و مفکر پاکستان، ایران

سے وابستگی، اقبال اور فارسی برصغیر میں فارسی کے تداول کی تاریخ، فارسی سرائی، اسلوب اقبال، اقبال کے نادر اور تازہ بتازہ کنایات اور جدید تراکیب، حاصل گفتگو پر مشتمل نو نکات۔ مولف نے (صفحہ ۸۸، ۸۹) کئی نادر تراکیب اقبال لکھی ہیں جیسے: آدم فریب، آشیاں بندی، بانمود، بے نمود، بیخودی، پائندہ شناسی، پر دم پیش اندوز، تلخ پوش (۲) تشنہ میر، خونیں ایاق، رمیدہ بو، سازو باز، شعلہ آشام، شعلہ نوش، نافہ مست، کہنہ برگ، بلذت پیدائی، نظارہ سوز، جنگاہ (جنگ، گاہ) سربکف، سکوں پرستی، جفا طلبی، خود افزا، خود افشاں، خود اندیش، دیر گیر، زیاں اندیش (۳) فطرت شناس، گراں واز اور گراں خیز...... اس سلسلے کے نو نکات میں سے آخری نویں نکتے کا ترجمہ کچھ اس طرح ہوگا۔

''اقبال اپنے عصر کو اس قابل نہیں جانتے تھے کہ اس کے اکثر افراد ان کے افکار سمجھ سکیں گے۔ انہیں عالم انسانی اور عالم اسلام کے مستقبل سے امیدیں تھیں کہ اس وقت ان کے افکار کی بہترین تفہیم ہو سکے گی خصوصا ایرانیوں کے ذریعے۔ اس وقت وہ زنجیر غلامی توڑیں گے، انقلاب کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے اور استعمار گروں نیز سیاسی سفاکوں کے کاخ و کو کو سرنگوں کر کے دم لیں گے۔ اقبال نے اس لئے اپنے آپ کو نوائے شاعر فردا کہا ہے اور اس مولف نے اس عظیم مفکر کی پیروی میں ان دو مثنویوں کے متن اور اس کی توضیحات کو یہ نام دیا ہے۔ علامہ اقبال نے کہا ہے

انتظار صبح خیزاں می کشم
اے خوش زرتشتیان آتشم

نغمہ ام از زخمہ بے پروا ستم
من نوائے شاعر فرداستم

عصر من دانندہ اسرار نیست
یوسف من بہر ایں بازار نیست

مثنویہائے اسرار خودی و رموز بیخودی کے متن پر مولف نے عمدہ لغوی اور معنوی بحثیں کی ہیں ۔اس کے علاوہ خودی اور بیخودی کے تصورات پر ان کے حواشی بہت گرہ کشا اور جامع نظر آئے ۔ان دونوں امور کے بارے میں ہم مثالیں فراہم کریں گے ۔ پہلے بعض حواشی کے تراجم ملاحظہ ہوں ۔ یہ حواشی، اسرار خودی کے متن پر ملتے ہیں:

۱۔

من کہ ایں شب را چو مہ آراستم
گرد پائے ملت بیضا ستم

حاشیہ ''نوائے فرد'' صفحہ ۱۱ برائے ''ملت بیضا'' بے آلائش اور پاک آئین و شریعت ۔ یہ اسلام کا کنایہ ہے ۔علامہ اقبال کے ہاں قدیم شعراء کی طرح ملت لغوی معنی میں دین و شرع کے مترادف استعمال ہوا ہے ۔ یہاں ملت بمعنی قوم لینے میں بھی حرج نہیں ۔ملت بیضا یعنی سفید رو قوم جو ملت کفر کے بالمقابل کہی گئی ہے ۔ قران مجید میں کئی بار اسلام کو نور روشنی اور کفر کو ظلمت و تاریکی کہا گیا ہے ۔

۲۔

حسن انداز بیاں از من مجو
خوانسا و اصفہاں از من مجو

خوانسار (حاشیہ صفحہ ۱۵) خواسار ضلع اصفہان کا ایک چھوٹا شہر ہے ۔اس لفظ کے دو اجزاء ہیں ۔خوان یا خانی ۔سار ۔خوان یا خانی چشمے کے معنی میں ہے اور سار بمعنی سر یعنی منبع کے لئے ۔مجموعی طور پر خوانسار بمعنی منبع آب ہے اور یہ مقام واقعی طور پر سر چشمہ آب ہے ۔

۳۔

وانمو دن خویش را خوے خودی است
خفتہ در ہر ذرہ نیروے خودی است

حاشیہ: کہا جاتا ہے کہ حسین چہرہ چھپا نہیں رہ سکتا (پریوتاب مستوری ندارد)۔ دوسرے مصرع میں ہاتف کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے ع

دل ہر ذرہ را کہ بشگافی
آفتا بیش درمیں بینی

عربی کا ایک شعر ہے

اتزعم انک جرم صغیر
و فیک انطوری العالم الا کبر؟

(کیا تو گمان کرتا ہے کہ تو چھوٹا سا وجود ہے جبکہ تجھ میں جہان بزرگ نہ کیا ہوا ہے۔؟) صفحہ ۱۶

۴۔

میش نتواند بزور از شیر رست
سیم ساعد ماہ ارو پولا دست

حاشیہ: شعر سعدی (گلستان) کے کلمات سے مستفاد ہے کہ

ہر ک با پولاد بازو پنجہ کرد
ساعد سیمین خود را رنجہ کرد

۵۔

اہل عالم را صلا بر خواں کند
آتش خود را چو باد ارزاں کند

حاشیہ: (صفحہ ۳۷): صلا یا یعنی بڑی اور عظیم آگ۔ عرب قبائل میں مرسوم تھا کہ جب کوئی اونٹ دعوت عام کے ذبح کرتے تو ''الصلا'' کی صدا بلند کرتے یعنی

بڑی آگ کے گرد جمع ہو جاؤ۔ اس اعتبار سے صلا فارسی میں بھی دعوت عام کا کنایہ بن گیا۔

۶۔

ماہی و از سینہ تا سر آدم است
چوں بنات آشیاں اندریم است
از نوا بر ناخدا افسوں زند
کشتیش در قعر دریا افگند

حاشیہ صفحہ ۳۷ بنات آشیاں اندریم: یعنی یہ شاعر سمندر کی خیالی اور تصوراتی لڑکیوں کے سے ہیں جن کے سر سے سینے کا حصہ ہی آدم زادوں کا سا ہے۔ استاد مجتبی مینوی مرحوم نے اپنے رسالے، اقبال لاہوری (صفحہ ۴۴) میں لکھا کہ یہ سمندر کی بیٹیاں ہیں حالانکہ شاعر کے بقول یہ لڑکیاں ہیں جن کے مسکن سمندر میں ہیں۔ (دوسرے شعر کے بموجب) یہ Sirenes ملاحوں کو خوش صدائی سے بہکا کر جہازوں اور کشتیوں کی غرقابی کا سبب بنتی ہیں۔

۷۔

از قم او خیزد اندر گورتن
مردہ جا نہا چوں صنوبر در چمن

اس قبیل کے رومی کے شعر یاد آتے ہیں

ہیں کہ اسرافیل و قتد اولیا
مردہ را زیشاں حیا تست و نما
جانہائے مردہ اندر گورتن
بر جہد زاوزہ شاں اندر کفن

۸۔

ہر کہ در قعر مذلت ماندہ است
ناتوانی را قناعت خواندہ است

یہ شعر مجھے ترجمہ ''کلیہ ودمنہ'' کے باب ''الاسد والثور'' (شیر اور بیل کے باب) کے ذیل کے بیت کی یاد دلاتا ہے۔

از دنایت شمر قناعت را
ہمتن را کہ نام کردہ است آز؟

۹۔

تا کجا خود را شماری ماء و طین
از گل خود شعلہ طور آفریں

یہاں شاعر اثر و خلاقی کی تلقین کی خاطر خود سے مخاطب ہے جسے Auto Suggestion کہا جاتا ہے۔ رومی نے ایسے ہی کہا ہے کہ

اے برادر تو ہمیں اندیشہ ای
ماقی تو استخوان و ریشہ ای
گر گلست اندیشہ تو گلشنی
در بود خاری تو ھیمہ گلخنی

۱۰۔

آشیا نش صورت عنقا بلند
مہر و مہ بر شعلہ فکرش سپند

یعنی اس کا مقام عنقا کے آشیانے کی طرح بلند تھا۔ ذیل کے شعر کی طرف اشارہ ہے۔

برو این دام بر مونغے دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

IqbalCyberLibrary.net All rights reserved. ©2002-2006

۱۱۔

پنجۂ حیدر کہ خیبر گیر بود
قوت او از ہمیں شمشیر بود

حاشیہ خیبر (صفحہ ۲۸): خیبر، مدینہ منورہ کے شمال میں تبوک کے راستے پر ایک مقام کا نام ہے۔ مدینہ اس کے بیچ میں ۲۵۰ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ حجاز کے یہودیوں کی زبان میں خیبر بمعنی قلعہ ہے۔ مقام خیبر پر سات قلعے تھے۔ ناعم۔ قموص، کتیبہ، شق، نطاۃ، وطیح اور سلالم۔ یہ قلعے ساتویں صدی ہجری میں مسلمانوں کے ہاتھ آئے اور اس غزوے کے فاتح اور ہیرو حضرت علی قرار پائے۔

۱۳۴۶ھ ش، ۱۹۶۷ء میں جب میں بطور سفیر سعودی عرب میں حجاج کی خدمت پر مامور تھے۔ میں نے یہ مقام دیکھا۔ ایک قلعے کی اب تعمیر نو کی گئی ہے۔

۱۲۔

از تہیدستاں رخ زیبا مپوش
عشق سلمان و بلال ارزاں فروش

حاشیہ رجال شعر (صفحہ ۳۷)۔ سلمان یعنی حضرت سلمان فارسی اصفہانی (م ۳۰ھ) عاقل و دانا شخص تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کے مخلص، حامی اور خدمت گزار۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سلمان میرے گھر کے افراد میں سے ہیں۔ صحیح بخاری میں آپ کی راویت سے ۶۰ احادیث ملتی ہیں۔ آپ کا مدفن مدائن (عراق) میں ہے جہاں زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔

سلمان رضی اللہ تعالی عنہ اور بلال رضی اللہ تعالی عنہ غیر عرب تھے۔ مسلمانوں کا ان پر اعتماد اور ان سے یگانگت اسلام کی مساوات، جمہوری انداز فکر اور عالمگیریت کی دلیل ہے۔

بلال رضی اللہ تعالی عنہ: حضرت ابو عبداللہ بلال بن صباح حبشی (م ۲۰ھ، ۶۴۱ء)

نبی اکرم ﷺ کے مامور موذن اور آپ کے معتمد خزانہ تھے۔ وہ ایک حبشی زادہ غلام تھے مگر اسلام کی دعوت سنتے ہی مسلمان ہو گئے اور دین حق پر استقامت دکھاتے ہوئے انہوں نے طاقت فرسا صعوبتیں اور مشکلات بسر کیں۔ رسول ﷺ اللہ کی رحلت کے بعد حضرت بلال نے اذان عام دی نہ کوئی کام کرنا قبول کیا البتہ وہ جہاد میں شرکت فرماتے رہے۔ آپ نے دمشق میں وفات پائی۔ صحیح بخاری شریف میں آپ کی روایت سے ۱۴۶ احادیث ملتی ہیں۔

مثنوی ''اسرار خودی'' کی کوئی ایک درجن متنی توضیحات بطور نمونہ نقل ہوئیں۔ ساری توضیحات سے ہمارا اتفاق کرنا ضروری نہیں۔ بعض توضیحات مولف کے فقہی مشرب کی عکاس ہیں اور بعض خیالی۔ مثلاً ذیل کے اشعار میں احساس تنہائی اور کسی محرم راز کے فقدان کو وہ عطیہ بیگم فیضی (و ۱۹۶۷ء) سے مزعومہ انس و ولا سے منسوب کرتے ہیں۔

انتظار غمگسارے تا کجا؟
جستجوئے رازدارے تا کجا؟
من مثال لالہء صحراستم
درمیان محفلے تنہاستم
خواہم از لطف تو یارے ہمدمے
از رموز فطرت من محرمے
ہمدمے دیوانہ ی فرزانہ ی
از خیال این و آں بیگانہ ی
تا بجان او سپارم ہوئے خویش
باز بینم در دل او روئے خویش

اقبال کے ایسے محرم راز، خودی شناس ہی ہو سکتے تھے۔ ایسے افراد کوئی ۲۰ برس

بعد جب انہیں میسر آنے لگے تو حضرت علامہ نے بال جبریل (اشاعت ۱۹۳۵ء) میں اظہار خرسندی فرمایا:

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

یہاں، اب مرے راز داں اور بھی ہیں

بہر اور اب خودی کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسین فریدنی کے جامع نوٹ میں سے ایک اقتباس بطور ترجمہ ملاحظہ ہو:

''شخصیت یا خودی کے فلسفے کی پرورش اس مثنوی میں نہایت دلکش انداز اور واضح صورت میں پیش کی گئی ہے۔ یہ نظریہ ایک طرف مدلل اور عمیق علمی مسئلہ ہے جس کا مقصد ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو معمولی اور حقیر جاننے اور مغرب زدہ ہونے سے بچیں، اور دوسری طرف اس امر کی طرف توجہ بھی دلاتا ہے کہ مسلمان شجاعت، شہادت امید اور ایمان جیسے اوصاف کے حامل بنیں۔

اس مثنوی کے پردے میں علامہ محمد اقبال نے دنیا بھر کے انسانوں، بالخصوص مسلمانوں اور بالاخص برصغیر ہند کے اپنے ہم مذہبوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ وہ خود شناس بنیں اور اپنی استعداد پر انحصار کریں۔ خودشناسی دنیا کے اجزاء اور عالم ہستی کے نظام کے اتصال سے عبارت ہے۔ مراتب وجود ہوں کہ عالمی تعینات، وہ سب خودی اور قوت شخصیت کے ساتھ براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔ اساس خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے۔ خودشناسی سے انسان حقیقی بے نیازی سیکھتا ہے اور دوسروں کی تقلید و گدائی سے اپنی آرزوؤں کی تکمیل سے باز رہتا ہے کیونکہ تقلید و احتیاج براری کی سعی سے خودی کمزور ہوتی ہے۔ جوہر خودی کی جلا اپنے نفس کی شناخت، خوداعتمادی اور عشق و عزم صمیم پر استوار ہوتی ہے۔ اس جوہر میں یہ توانائی ہے کہ فطرت کی جملہ پوشیدہ اور ظاہری قوتوں کو مسخر کرسکتا ہے۔ خودشناسی سے اعراض اور اسے مٹانے کی کوششیں شکست خودی اور غلام اقوام کے حربے ہوتے

ہیں تا کہ اس طرح غالب اور توانا اقوام کے اخلاق اور کردار کو کمزور کریں اور اس طرح ان کی دست درازیوں سے ایمن رہ سکیں۔ مشہور ہے کہ ایک دفعہ بھیڑوں نے شیروں کو گھاس کھانے اور گوشت خوری سے تائب ہونے کی تلقین کی۔ شیر بھیڑوں سے فریب کھا گئے اور یوں اپنے پنجے اور روانت بیکار کر بیٹھے۔ یونانی فلسفی افلاطون جس نے مسلمانوں کے ادب و عرفان کو متاثر کیا، وہ بھی مسلک گوسفندی کا داعی تھا۔ عجمی شعر و تصوف افلاطونی اوہام سے اثر پذیر ہوا اور اس سے متاثر شعراء و صوفیا نے موت اور فنا کو راہ نجات گردانا ہے، حالانکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے ان کا کام تھا کہ لوگوں کو امید و سربلندی کا پیغام دیتے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ گداصفتی کے مداح اور بے شخصیت شعراء کی غلط تعلیم سے بچنا چاہیے اور مسلمانوں میں یاس و نومیدی، ناخود شناسی اور غفلت و سستی کے افکار زشت پھیلنے کا تدارک کرنا چاہیے۔

خودی دو مرحلوں سے گزر کر تیسرے میں مکمل ہوتی ہے۔ مرحلہ اول قرآن مجید اور عام اسلامی تعلیمات میں بیان شدہ اوامر و نواہی کی پابندی ہے۔ دوسرا مرحلہ ضبط نفس اور شخصیت سازی کا ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ فرد اپنے جذبات پر ضبط کرے اور اس کے تحمل پذیر اعمال سے اخلاق و شرع کی پابندی مترشح ہو۔ تیسرا مرحلہ نیابت الٰہی کا ہے جو انسانیت کا کمال اور خلافت الٰہی کا مظہر ہے۔ اللہ کا خلیفہ یا مرد کامل قوائے کائنات کو مسخر کر لیتا ہے۔ ایسے کامل فرد کا ایک نمونہ اقبال نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شخصیت کے ذکر سے پیش کیا ہے۔ وہ خلیفتہ اللہ اور ولی اللہ تھے اور اس انسان کامل کی زبان پر احکام الٰہی جاری و ساری رہے۔

اس مثنوی میں اقبال نے بعض داستانیں اور حکایات نقل کیں اور مسلمانوں کو بتایا کہ ان کا مقصد جو الارض کی خاطر فتوحات کرنا، کسی خاص خطہ وطن یا رنگ و نسل یا زبان کا حامی و مبلغ بننا شائستہ نہیں۔ ان کا ہدف اعلائے کلمتہ اللہ، دوسرے مسلمانوں کے لئے ایثار کرنا اور اپنے درمیان اتحاد اور اخوت کے روابط استوار رکھنا ہے۔ آخر

میں اقبال نے مسلمانوں کی بیداری، ان کی خود شناسی اور ان کے اتحاد و اتفاق کی بڑی دل سوسازانہ دعا کی ہے۔ وہ آرزو کرتے ہیں کہ مسلمان نا خود شناسی اور تنگ نظری کے امراض سے مصئون رہیں۔

مثنوی ''اسرار خودی'' لفظ و معنی اور اسلوب کے اعتبار سے مثنوی کی تقلید میں ہے اور اس میں رومی کے عارفانہ افکار عصری تقاضوں کے مطابق بیان ہوئے ہیں۔ آے قرآن ہے: یا ایھا الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل ازا اھتد یتم ...... (۱۰۵: المائدہ) یعنی اے اہل ایمان۔ تم پر اپنے نفوس اور خودیوں کی حفاظت فرض ہے۔ جب تم ہدایت پزیر ہو تو کوئی برگستہ راہ تمہیں گمراہ نہیں کر سکے گا۔ یہ آیہ مبارکہ اور حدیث کے طور پر معروف ہونیوالا یہ قول کہ و من عرف نفسہ فقد عرف ربہ، اقبال کے تصور خودی کے منابع ہیں۔ اگر اس مثنوی کے بعض مضامین فریڈرک نطشے یا ہنری برگساں کے افکار کے مماثل ہوں تو یہ محض اتفاق اور توارد ہے کیونکہ اسرار خودی اساساً اسلامی تعلیمات کی حامل ہے۔ اقبال نے اپنے مکاتیب میں بجا لکھا ہے کہ مثنوی اسرار خودی کے افکار و مطالب کو وہ اس زمانے سے ذہن میں منظم کر رہے تھے جب ان دو فلسفیوں کا نام تک انہوں نے نہیں سنا تھا۔ (صفحہ ۵ تا ۷)

مثنوی ''رموز بیخودی'' کے متنی حواشی بھی مثنوی ''اسرار خودی'' کی منقلہ بالا مثالوں کے سے ہیں۔ ''رموز بیخودی'' کے تعارف میں بیخودی پر کا توضیحی نوٹ فارسی کتب اقبالیات کے تناظر میں خاص اہمیت کی حامل ہے کیونکہ فارسی نویسندگان کتب اقبال شناسی، علامہ اقبال کی اس نئی اصطلاح سے خاطر خواہ تعرض کم ہی کر سکے تھے۔ تہران سے اشاعت پذیر فارسی کے اسلامی دائرۃ المعارف (جلد دوم) میں بے خودی باصطلاح اقبال پر راقم الحروف سے نوٹ لکھوایا گیا ہے۔ بہر طور پر پہلے چند حواشی دیکھیں:

چوں مقام عبدہ محکم شود

کاسہ دریوزہ جام جم شود

حاشیہ عبدہ، (صفحہ ۹۴): قرآن مجید کی پانچ آیات میں لفظ عبدہ، استعمال ہوا ہے۔ سورۃ مریم کی آیت سوم میں اس سے مراد حضرت زکریا ہیں اور باقی چار میں حضرت محمد ﷺ: سورۃ فرقان آیت ۲، سورۃ زمر ۳۶، سرہ النجم آیت ۱۰ اور سورۃ الحدید آیت ۹۔ عبدہ، خدا کی مخصوص بندگی سے عبارت ہے۔

۲۔

شاہ عالمگیر گردوں آستاں

اعتبار دودمان گورگاں

(حاشیہ ۹۸) اورنگ زیب بن شاہجہان خرم بن جہانگیر سلیم بن اکبر اولاد بابر سے چھٹا مقتدر بادشاہ تھا (۱۶۱۸۔ ۱۷۰۷ء)۔ اس نے اپنے والد شاہجہان کو قید کروایا اور بھائی محمد داراشکوہ کو بدعقیدہ ہونے کے الزام میں قتل کروادیا۔ آپ نے بہت سی مساجد بنوائیں۔ موسیقی اور تصوف کے آپ مخالف تھے۔ دکن، گولکنڈہ اور بیجاپور کو فتح کر کے انہوں نے اپنی قلمرو میں شامل کرلیا تھا۔

گورگان۔ گرکن، ضمہ اور فتحتین۔ ترکی میں داماد کے معانی میں ہے۔ امرے تیموو، امرے سمرقند کے داماد ہونے کے ناتے سے اس لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔

۳۔

شیر ببر آمد پدید از طرف دشت

از خروش او **فلک** لرزندہ گشت

بوئے انساں داش از انساں خبر
پنجہ عالمگیر را زد بر کمر

حاشیہ شیر کشی اورنگ زیب (صفحہ ۹۹): دور جوانی میں اورنگ زیب کے ہاتھوں شیر شکار ہونے کا واقعات تواریخ میں مذکور ملتے ہیں، مثلاً شاہجہان نامہ میں، مگر حالت نماز میں اس بادشاہ کی شیر کشی کا یہ واقعہ میں نے نہیں پڑھا۔

۴۔

حرف بے صوت اندریں عالم بدیم
از رسالت مصرع موزوں شدیم

حاشیہ صفحہ ۱۰۱: یہ غیر معمولی خوبصورت تشبیہ ہے۔ دین کو حروف صدا دار سے تشبیہ دی گئی۔ اس سے بے صدا حروف صدادار بنتے ہیں۔ اور پھر وہ وزن و قافیہ میں ڈھل کر مصرع و شعر بنتے ہیں۔ یہ کتنا دل پذیر بیان ہے۔

۵۔ قصہ ابوعبیدہ و جاباں (بتائید اخوت اسلامیہ: حاشیہ صفحہ ۱۰۲)

اس بات سے تعجب ہوا کہ مولف حضرت ابوعبیدہ الجراح، فاتح شام اور حضرت ابوعبیدہ ثقفی ہیرو، آزمائے جاباں میں امتیاز نہیں کر سکے۔ یہ غلطی پاکستان کے بعض شارحین اقبال کے ہاں بھی مشہور ہے (مترجم)۔

۶۔

ساخت آں صنعتگر فرہاد زاد
مسجدے از حکم سلطان مراد

حاشیہ سلطان مراد عثمانی (صفحہ ۱۰۵) عثمانیوں میں سے پانچ سلاطین کا لقب مراد تھا۔ مغرب میں انہیں Amurat کہتے ہیں۔ ان میں زیادہ معروف اور شکورہ مند مراد دوم تھے۔ (۱۴۵۱۔۱۴۲۱)۔

انہوں نے شہر بورسہ میں عالی شان عمارات بنوائیں جن میں ایک مسجد بھی تھی۔

اقبال کا بیان کردہ واقعہ شاید اسی مسجد سے مربوط ہو۔ اس سلطان نے شہر قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا مگر اسے فتح نہ کر سکا۔ یہ کام اس کے فرزند سلطان محمد (فاتح) نے انجام دیا تھا۔

۷۔

قلب ما از ہند و روم و شام نیست
مرز و بوم او بجز اسلام نیست

پیش پیغمبر چو کعب پاک زاد
ہدیہ ای آورد از بانت سعاد

حاشیہ مرز و بوم اسلام: قرآن مجید میں ہے (۱۳:۱۳ الحجرات) کہ اے لوگو ہم نے تمہیں نر اور مادہ سے پیدا کیا اور تمہیں تعارف کی خاطر گروہ اور قبائل میں بنایا۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے وہ زیادہ محترم ہے جو متقی تر ہو۔ اسلام میں وطنی قومیت نہیں۔ تاریخ اسلام میں اسے پہلی بار غالباً شاہ اسماعیل صفوی اور سلطان سلیم عثمانی نے ہوا دی اور اپنے اپنے فقہی مسلک کے لوگوں کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں سید جمال الدین (۴) کی مساعی کے زیر اثر اتحاد مسلمین کی کوششیں کی جانے لگیں اور کلام اقبال میں یہ موضوع نہایت عمدگی سے بیان ہوا ہے۔

حاشیہ حضرت کعب (وہی صفحہ): ابو المضرب کعب بن زہیر ابن سلمی (۲۶ھ، ۶۴۵ء) اہل نجد میں سے تھے۔ ان کے والد زہیر دور جاہلی کے نامور شاعر تھے جن کا سبعہ معلقہ میں شامل قصیدہ اس مطلع سے شروع ہوتا ہے۔

امن الی اوفی دمنہ لم تکلم
بحو مانہ الدراج فا لمتثلم

کعب کے خاندان کے جملہ لوگ شاعر تھے۔ ان کا جو قصیدہ فتح مکہ کے بعد بار گاہ رسول ﷺ میں مقبول ہوا اور شاعر کو ردائے رسول کا صلہ ملا، اس کا مطلع ذیل ہے۔

بانت سعاد فقلبی الیوم متبول
مدلہ اثر ھالم یفد مکبول

قصیدہ آگے بڑھاتے ہوئے شاعر نے یہ شعر پڑھا:

ان الرسول لسیف یستفاء بہ
مھند من سیوف الھند مسلول

پیغمبر اکرم ﷺ کو چونکہ کسی خاص خطہ زمین سے نسبت پسند نہ تھی۔ آپ ﷺ نے حضرت کعب سے فرمایا مھند منسیوف اللہ کہیں۔

اقبال بعد کے اشعار میں اس کا اشارہ کرتے ہیں۔

در ثنائش گوہر شب تاب سفت
سیف مسلول از سیوف ہند گفت

آن مقامش برتر از چرخ بلند
نامدش نسبت بہ اقلیمے پسند

گفت سیف من سیوف اللہ گو
حق پرستی، جز براہ حق مپو

۸۔

نیست میش ناتوان لاغرے
در خور سرپنجۂ شیر نرے

حاشیہ(صفحہ ۱۴۰):علامہ اقبال کی نظر میں اسلام قوت اور جہاد اور مبارزہ والا دین ہے۔حدیث نبوی ہے الجنتہ تحت ظلال السیوف ۔ جب تک مسلمانوں نے جہاد و قتال اور پیکار کی سرشت اپنائے رکھی اور اپنا بھرپور دفاع کیا اس وقت تک وہ شکوہ مندی سے ترقی کرتے رہے، مگر جب سے انہوں نے سستی اور اضمحلال دکھانا شروع کیا اور مبارزہ ترک کر دیا، نکبت اور سر بزیری ان کا مقدر بنتی گئی ۔

ملت ما شان ابراہیمی است
شہد ما ایمان ابراہیمی است

صفحہ ۱۴۰ کا حاشیہ: مولف لکھتے ہیں کہ اقبال نے شان، کے معنی کندوئے عسل یا چھتہ کے جو لکھے ہیں، وہ انہیں کسی لغت میں نہیں ملے ۔اس پر تعجب ہوتا ہے کہ شان بمعنی چھتہ فارسی کی چھوٹی سے چھوٹی لغت میں بھی موجود ہے مگر انہوں نے ایسا کیسے لکھا ہے؟

عشق ورزی از نسب باید گذشت
ہم ز ایران و عرب باید گزشت

حاشیہ(صفحہ ۱۴۶)یعنی ہم مسلمان ہیں پھر ایرانی، ترک یا عرب۔

ایمان روح میں کارفرما ہوتا ہے۔اور نسب جسم میں۔ ظاہر ہے کہ روح کا رشتہ جسم سے کہیں عظیم اور پائدار ہے۔علامہ اقبال یہاں ایرانیوں اور عربوں پر انتقاد کرتے ہیں جو آریائی یا عرب نژاد ہونے پر فخر کرتے رہے ہیں۔

مولف مثنوی ’’اسرار خودی‘‘ کے ہر عنوان کے مطالب پر واوین میں مفید عبارات کے ذریعے پہلے توضیحات پیش کیں اور پھر شرح اور حواشی دار متن پیش کیا ہے۔خودی پر ان کا نوٹ ہم نے اوپر نقل کیا تھا۔اب بے خودی کی ان کی توضیح کا ترجمہ ملاحظہ کریں۔ اس مثنوی میں اقبال نے یہ بات واضح کی ہے کہ محفوظ اور تربیت یافتہ خودیوں کو کس طرح مخلوط متحد کیا جائے تا کہ افراد بہتر اسلامی معاشرہ

تشکیل کر سکیں۔ امت اسلام کسی خاص خطے میں محصور نہیں کی جا سکتی ۔ بے خودی، خودیوں سے استفادہ کرنا ہے تا کہ معاشرہ بہتر تربیت، بہبود عامہ اور وسعت پذیری کا عکاس ہو۔ حقیقی اسلامی بے خودی۔ اسلام معاشرے کی اساس باقی رکھنا ہے۔ مسلم بے خودی خدا اور رسول کی محبت کے مقام کے گرد گھومتی رہتی ہے اور اس معاشرے کا نقطہ ماسکہ کعبتہ اللہ ہے۔

اقبال نے مثنوی کے آغاز میں مسلمانوں کو اسلامی اقدار کی پاسداری کی تلقین کی۔ وہ فرد و ملت کا ناگزیر رابطہ واضح کرتے ہیں اور اس رابطے کے ڈھیلا ہونے کے نقصانات بھی بتاتے ہیں۔

مسلمانوں کے بنیادی عقائد توحید و رسالت ہیں۔ توحید نومیدی، خوف اور غم کا ازالہ کرتی ہے اور نبوت قوم کی تشکیل کرتی اور ایک توانا معاشرتی نظام دیتی ہے۔ رسالت حضرت آخر زمان ﷺ، نور ہدایت اور ملت ساز ہے۔ اسلامی معاشرے کی بنیادی تعلیم اخوت، حریت اور مساوات کے سہ گانہ اصولوں پر مبنی ہے۔ توحید کا حامل دین ابدی ہے اور زمان و مکان اس کے مطیع ہیں۔ حضرت خاتم الانبیاء رحمتہ اللعالمین ہیں اور ان کی امت رنگ، نسل اور زمان و مکان کے علائق سے منزہ ہے۔ اسلام ایک نظریے اور عقیدے کا نام ہے لہذا مسلمان ایک عالمی قوت ہیں جو محدود وطنیت کے تصور سے ماوراء ہے۔ اس قوم کا دستور زندگی قرآن مجید ہے جو ابدی وسیلہ ہدایت ہے۔

اقبال اجتہاد کے داعی ہیں مگر دور زوال کے اجتہاد کو پر فتن جانتے ہوئے احتیاطاً تقلید فقہا کو بہتر قرار دیتے ہیں۔ وہ سلف صالحین کی پیروی کو ایک محفوظ روش بناتے ہیں۔ سیرت کی پختگی خدائی رہنمائی کی حامل تعلیمات اسلامیہ سے ملتی ہے۔ سیرت محمدیہ ایک اسوہ حسنہ ہے جس کا اتباع ضروری ہے۔ مسلمان بیت الحرام کے پاسبان ہیں اور یہ مقام محترم ان کے قومی تشخص اور ملی وحدت کا پاسبان ہے۔ ہر معاشرہ کسی

ہدف عظیم کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ اسلامی معاشرہ توحید کی نشر و اشاعت کی ایک ملی فریضے کے طور پر پیش نظر رکھتا ہے۔ قومی زندگی کا توسعہ و تکامل، علوم طبیعی میں مہارت اور قوائے فطرت کی تسخیر کرنا بھی مسلم معاشرے کے اعلیٰ اہداف اور مقاصد ہونے چاہییں۔

بے خودی یا قومی زندگی کا کمال اس وقت نمایاں ہوگا جب ہر خودی یا فرد کو دوسروں سے متحد ہونے کا احساس پیدا ہوگا۔ ہر فرد کا احساس ملی ایثار و اخلاص کا ضامن ہوگا۔ قومی تاریخ اور روایات اس احساس کو اجاگر کرتی ہیں۔ امومت یعنی ماں کے احترام خاص سے ملت اسلامیہ کی خانوادگی زندگی کی تکریم ہوئی ہے۔ اقبال مقام مادری کو بہت احترام دیتے ہیں اور تلقین کرتے ہیں کہ کہ مسلمان عورت شوہر کی اطاعت اور اولاد کی تربیت کے سلسلے میں حضرت فاطمۃ الزہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اسوہ کی پیروی کرے۔ عورتیں عفت و حجاب کو اپنا شعار بنائیں اور اس جاہلانہ تبرج سے بچیں جو مغربی عورتوں کا خاصہ بن رہا ہے۔ مثنوی کے آخر میں اقبال نے سورۃ اخلاص کی ایک مختصر تفسیر پیش کی ہے۔

مثنوی ''رموز بے خودی'' ۱۰۱۸ اشعار ہیں۔ اس میں فلسفہ خودی کا حاصل اور نتیجہ ملتا ہے۔ اس میں ایک متحد و منظم قوم کی تشکیل کے راز بیان کئے گئے ہیں۔ اقبال کا مقصد یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو یہ احساس دلا سکیں کہ قرآن مجید کی تعلیم کی اساس اور سلف صالحین کی سیرت پر مبنی ایک امہ متحد کی تشکیل نو ضروری ہے۔ ان دونوں مثنویوں کی تعلیم دین اسلام کی امثلہ پر استوار ہے اور ان کے مخاطب مسلمان ہیں، تاہم ان کے ماحصل اور ہدف سے تمام استعمار زدہ اور مظلوم و پسماندہ اقوام مستفیض ہو سکتی ہیں بالخصوص اقوام مشرق جنہیں مغربی استبداد و استثمار نے مفلوک الحال بنائے رکھا اس طرح ملحد، نیچر پرست اور کمونسٹ وغیرہم ان کو مزید دبانے لگے اور ہر طرف سے ان پر یورشیں ہوتی رہیں۔ ان گمراہ مماجموں نے انسانوں کو مشین بنا دیا

اور یہ مشین بے نیل مرام چکر کاٹتی رہی ہے۔ صنعتی اور معاشی تمدن روحانیت سے عاری اور اعلیٰ مقاصد کا فاقد ہے۔ اقبال روح وجسم دونوں یا سوادتمدن اسلامی کا تداول چاہتے تھے۔ اقبال نے اس لیے سرسبزیری اور ناتوانی کی تعلیم دینے والے صوفیا سے بھی تعرض کیا کیونکہ ایسے لوگ فنا کو بقا اور کامرانی بتاتے تھے۔ یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اقبال کی مجوزہ بے خودی (ملت سازی) ترک تعلقات اور مردن پیش از مرگ کی تعلیم ہرگز نہیں دیتی......(صفحہ ۸۳تا ۸۵)

محمد بقائی (ماکان) کی کتب اقبال شناسی اور تراجم اقبالیات

محمد بقائی (ماکان) ایک جوان سال صحافی اور مصنف ہیں۔ وہ ایران کے علاوہ امریکہ میں بھی پڑھے ہیں۔ انگریزی پر ان کی خوب دسترس ہے۔ ان کی دو کتابیں زیر اشاعت ہیں: (الف) ''خیال وصال''۔ یہ اقبل کی دوبیتیوں کی تشریح وترتیب نو ہے۔ انہوں نے ارمغان حجاز کی جملہ دوبیتیوں کا استقصائی مطالعہ کیا ہے۔ (ب) فلسفہ آموزشی اقبال'' جو ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین مرحوم کی انگریزی کتاب کا ترجمہ اور تحشیہ ہے۔ یہ کتاب انہوں نے از راہ محبت اور قدر دانی میرے نام معنون کی ہے۔ محمد بقائی (ماکان) کئی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ اقبال اور اقبالیات کے سلسلے میں ان کی درج ذیل کتب راقم کی نظر سے گزری ہیں: ٗ

ا۔ مے باقی شرح وبررسی تطبیقی غزلہائے علامہ اقبال:

یہ کتاب خزاں ۱۹۹۱ء میں انتشارات حکمت خیابان انقلاب اول ابوریحان، تہران نے تین ہزار نسخوں میں شائع کی۔ ابتدائی صفحات میں علامہ اقبال کی تصویر ہے اور ان کے فارسی خط کا نمونہ (زبور عجم کی غزل شمارہ تحریر ۲۲ فروری ۱۹۲۸ء) سرنامے میں زبور عجم ہی کا (حصہ اول شمارہ ۲۳) درج ذیل شعر نقل کیا گیا ہے۔

دریں محفل کہ کار او گذشت ازبادہ و ساقی
ندیمے کو کہ در جامش فروریزم مئے باقی

پیش گفتار میں (صفحہ ۹ تا ۱۰) میں مولف نے غزل اقبال کی چند معنوی خصوصیات بیان کی ہیں: جیسے شہزادہ ایرج مرزا (۱۹۲۴ء) نے کہا تھا کہ غزل سیاسی نہ ہو مگر اقبال کی غزل فرخی سیستانی مداح سلطان محمود بلکہ عارف قزوینی سے بھی زیادہ سیاسی ہے۔ اس میں دین وفلسفہ ایسے سمویا ہوا ہے جیسا کہ ناصر خسرو (۴۸۱ھ) کی غزلیات ہیں ان کی غزلوں کا اسلوب گونیا ہے تاہم ان کا جذب وشوق غزلیات رومی کا سا ہے۔ مولف نے اردو دان حضرات کی مدد سے چودھری محمد حسین مرحوم کے مقالے بسلسلہ غزلیات زبور عجم کی باتیں بھی نقل کی ہیں کہ ا: اقبال کی غزلوں میں تعداد ابیات سے بے نیازی ہے۔ ۲: مطلع وہ کہیں نہیں لکھتے اور ان کے مقطعوں میں غزلیات رومی کی طرح تخلص شاذ ہی نظر آتا ہے۔ ۳۔ ان کے دوبیتی یا سہ قطعے بھی غزلیات کے اجزا معلوم ہوتے ہیں خواہ زوج در زوج ہوں یا مطالع سے آزاد۔ انہیں غزلوں میں شامل کر کے مولف نے کل غزلیات اقبال ۱۸۹ کی تعداد میں ترتیب دی ہیں۔ انہوں نے ہر غزل کو ایک عنوان دیا اور متن کو الفبائی ترتیب سے مدون کر کے اس پر لفظی اور معنوی حواشی لکھے ہیں۔ آخر میں انہوں نے مفید فہارس بنائیں اور اعلام اور اشاریے سہولت خیز صورت میں پیش کیے۔ بڑی تقطیع میں کتاب ۴۱۰ صفحات پر محیط ہے۔ ڈاکٹر نبی بخش قاضی تہران میں پاکستانی درسگاہ کے پرنسپل ہے۔ ڈاکٹر محمد اسلم خان فارسی ادب کے ایک فاضل شخص ہیں۔ ان دونوں حضرات نے مولف کی مدد کی اور پیش گفتار میں ان کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ مولف ترتیب متن میں کچھ غلط فہمی کا شکار رہے۔ مثلاً پیام مشرق کے حصے "باقی" اور اس کتاب کے ایک دوسرے جزوہ "افکار" کے بارے میں۔ اس طرح "جاوید نامہ" کی ان غزلوں کو وہ شخص نہ کر سکے جو "پیام مشرق" اور "زبور عجم" سے ماخوذ ہو کر اس کتاب میں دوبارہ شامل ہوئی ہیں۔ تاہم یہ کتاب توجہ طلب ہے۔ یہ بات کتنی خوش آئند ہے کہ ایرانی یونیورسٹیاں اسے اپنا نصاب درس بنا چکی ہیں۔ اس میں اقبال اور

شعرائے فارسی کا تقابلی حصہ راقم کی کتاب ''اقبال اور فارسی شعراء'' کا سا ہے۔ (شائع کردہ اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۷۷ء) ابتدائی غزلوں کے چند اشعار کے حواشی اور معانی میں بطور نمونہ ترجمہ کر کے پیش کر رہا ہوں۔ پہلا شعر ''زبور عجم'' میں سے ہے۔ (حصہ اول غزل ۵۴)

ا۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست

سوئے قطار می کشم ناقہ بے زمام را

حاشیہ مولف (صفحہ ۳۵ تا ۳۷) ۔تیسرے شعر کے الفاظ سے استفادہ کر کے غزل کا عنوان ''سرور زندگانی رکھا گیا ہے۔

اقبال اپنے ہم عصر کے بعض شعرا کی غیر ذمہ دارانہ روش کے پیش نظر اپنے آپ کو زمرہ شعرا سے جدا بتاتے رہے۔ جو لوگ ان سے شاعرانہ ہنگامہ آرائی اور مضمون آفرینی کی توقع رکھتے تھے، ان کی فرمائش کبھی پوری نہ ہوتی تھی۔ اقبال کا مقصد شعر اصلاح و رہنمائی تھا نہ کہ مضمون آفرینی اور مشاعرہ و محفل آرائی۔ انہوں نے اپنے ہدف شعر کو کئی بار واضح کیا ہے۔ ''پیام مشرق'' کی ایک غزل کا مطلع ہے

با ایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم

غزل سرایم و پیغام آشنا گویم

مثنوی ''اسرار خودی'' میں آپ نے کہا ہے

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست

بت فروشی ، بت گری مقصود نیست

اس لحاظ سے اقبال فارسی میں ناصر خسرو علوی (م ۴۸۱ھ) کی طرح ہیں جو اپنے افکار و عقائد بزبان شعر بیان کرتے رہے۔ اقبال اس مناسبت سے مثنوی ''گلشن راز جدید'' کی تمہید میں عام طرز شاعری سے صراحتہً بیزاری کا اظہار کرتے

ہیں۔

ز جان خاور آں سوز کہن رفت
دمش واماند و جان او ز تن رفت

چو تصویرے کہ بے تار نفس زیست
نمی داند کہ زوق زندگی چیست؟

کشودم از رخ معنی نقابے
بدست زرہ وادم آفتابے

نپنداری کہ من بے بادہ مستم
مثال شاعراں افسانہ بستم
نبینی خیر ازاں مرد فرد دست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست

بہ کوئے دلبراں کارے ندارم
دل زادے، غم یارے ندارم

مرا زیں شاعری خود عار ناید
کہ در صد قرن یک عطار ناید

آخری تضمین شدہ شعر سے واضح ہے کہ اقبال، عطار کے سے شعراء میں شامل

کیے جا سکتے ہیں۔ عطار بھی تو شعر کے ذریعے لوگوں کو پیغام عرفان ابلاغ کرتے رہے تھے۔ ڈاکٹر محمد علی اسلامی نے بھی اقبال پر اپنی تالیف ''دیدن دگر آموز'' کے مقدمے میں لکھا ہے: ''اقبال نے ناصر خسرو کی طرح شعر کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ شعر کی طبعی زیبائی سے قطع نظر وہ خواہ مخواہ کی سخن آرائی سے محترز ہے۔ ان سا دوسرا شاعر شاذ ہی ملے گا۔ انکے ہاں عاشقانہ غزل ناپید ہے اور کوئی مخصوص محبوب بھی مفقود۔ ان کا خطاب عام لوگوں کے ساتھ رہا ہے۔ ان کا بڑا پیغام سعی و بیداری ہے۔ وہ نیند کے متوالوں کو برخیز کہتے رہے اور بیدار دل انسانوں کو آداب زندگی سکھاتے رہے۔۔

اس شعر کیا ختتامی الفاظ شاعر کے مقصود شاعر کے مقصود کو واضح کرتے ہیں۔ اقبال عرف عام کے شاعر تو نہ تھے، مگر ملت اسلامیہ کا اتحاد اور اس کی پیشرفت کی سعی سے وہ کبھی روگرداں نہ ہوئے۔ اس لئے وہ ملت گم گشتہ کو منزل کامرانی تک پہنچانے کی اپنی کوشش کا یہاں برملا ذکر کرتے ہیں۔ ایسے متعہد شعرا گاہے بگاہے ہی پیدا ہوں گے۔

۲۔

اگر ایں کار را کار نفس دانی چہ نادانی
دم شمشیر اندر سینہ باید نے نوازی را

منقولہ شعر زبور عجم کی ایک غزل (حصہ دوم غزل شمارہ ۴۷) کا مقطع ہے۔ اس کے مطلع کے ایک مصرع کے الفاظ سے شارح و مرتب نے اس کا عنوان درد آشنا رکھا ہے ع

تو اے درد آشنا بیگانہ شو از آشنائی ہا

حاشیہ بر ''مے باقی'' (ص ۵۴)۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اگر تو نے نوازی کو صرف سانس کا کام جانتا ہے تو نادان ہے۔ نے نوازی (شاعری) کے لیے نرم لحن نہیں

بلکہ تلوار کی سی تیز اور براں دھار کی ضرورت ہے۔ اس شعر میں لفظ ''دم'' بڑا استادانہ استعمال ہوا ہے۔ دم شمشیر کا لبہ یا اس کی دھار ہے اور نفس بھی۔ اس شعر سے واضح ہے کہ اقبال کے نزدیک نے نوازی یا شاعری نفس کشی اور لحن نوازی نہیں، یہ تو برِس شمشیر کا مظہر کام ہے۔

۳۔

از آن بر خویش می بالم کہ چشم مشتری کور است
متاع عشق نا فرسودہ ماند از کم روائی ہا

بروں آاز مسلماناں، گریز اندر مسلمانی
مسلماناں روا دارند، کافر ماجرائی ہا

غزل ''زبور عجم'' (حصہ دوم شمارہ ۵۶) کے آخری اشعار (۵ اور ۷) ہیں۔ پہلے منقولہ شعر کی ترکیب ''متاع عشق'' کو غزل کا عنوان بنایا گیا۔ ان اشعار کی تراکیب اور الفاظ کے معانی لکھنے کے بعد مرتب غزلیات نے یہ حاشیہ لکھا ہے (صفحہ ۶۴)

''...... ان اشعار میں علامہ اقبال مسلمانوں کے شاکی ہیں خصوصا برصغیر کے معاصر مسلمانوں کے۔ اس شکایت کو ''مثنوی پس چہ باید کرد'' میں اشکے بر افتراق ہندیاں'' کے عنوان سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ''پیام مشرق'' کی ''پیشکش'' میں افغانستان کے سابق حکمران امیر امان اللہ خان سے خطاب نے بھی یہ شکایت ہے کہ

مسلم ہندی شکم را بندہء
خود پرستے دل ز دیں بر کندہء

اس کتاب کی ایک غزل میں ہے

به خاک هند نوائے حیات بے اثر است

که مرده زنده نگردد ز نغمه داؤد

مسلمانان ہند کی فریب خوردگی کی شاعر ”جاوید نامہ“ کے خیالی افلاکی سفر میں بھی بیان کرتا ہے۔ (فلک زحل)۔ یہاں غداران وطن مبتلائے عذاب ہیں اور روح ہند فریادی ہے کہ

کے شب ہندوستاں آید بروز

مرد جعفر، زنده روح او ہنوز

تا ز قید یک بدن وا می رہد

آشیاں اندر تن دیگر نہد

گاه او را با کلیس ساز باز

گاه پیش دیریاں اندر نیاز

جعفر سے مراد جعفر بنگالی ہے جس نے حاکم بنگال نواب سراج الدولہ سے ۱۷۵۷ء کی جنگ میں غداری کی اور مسلمانوں کی انگریزوں کے ہاتھوں شکست کا موجب بنا۔ دیریاں یعنی ہندو برہمن۔

۴۔

ضربت روزگار اگر نالہ چو نے دہد ترا

بادہ من ز کف منہ چارہ ز مومیا طلب

یہ بھی زبعر عجم کی ایک غزل کا مقطع ہے (حصہ دوم شمارہ ۴۷)۔ غزل کے مطلع کے الفاظ سے اخز کر کے اس کا عنوان صحبت آشنا“ رکھا گیا۔ اس شعر کے معانی بیان کرنے میں شارح نے کئی حضرات کی معاونت کا ذکر کیا ہے۔ (صفحہ ۶۸، ۶۹)

All rights reserved.
©2002-2006

۔حاصل مطلب یہ کہ اقبال کہتا ہے کہ سخت مشکلات میں اس کے بادہ شعر کو ترک کر کے مومیائی سے کام لو۔ مومیائی نے کے قرینے سے شعر رومی ہے یا کلام اقبال کے عام تناظر میں اسلامی اور قرآنی تعلیمات۔

اس شعر کے بارے میں راقم اور شارح کے درمیان کافی مکاتبت ہوئی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اقبال مدعی ہے کہ اس کی شاعری اور تعلیم سرمو قرآن کے خلاف نہیں (دیکھیں) مثنوی ''رموز بے خودی'' کا اختتامی حصہ) لہذا اس کے ہاں بادہ بھی ہے اور مومیائی بھی۔ زیادہ سے زیادہ بادہ اس کی جمالی تعلیم ہے اور مومیائی جلالی۔ یہ تعلیم سیرت پیغمبر اکرم ﷺ سے متبادر ہے۔ اور تخلقو باخلاق اللہ کا خاصہ بھی کہ

شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنید و بازید تیرا جمال بے نقاب

شارح نے ان معانی پر نظر ثانی کرنے اور دوسری اشاعت میں ترمیم کرنے کا مجھے لکھا ہے۔ بہر حال یہ قابل قدر کتاب غزلیات اقبال کی فارسی میں پہلی شرح ہے۔

باز سازی اندیشہ دینی در اسلام: یہ علامہ اقبال کے سات انگریزی خطبات کا ترجمہ اور تحشیہ ہے۔ ۱۹۶۷ء میں پروفیسر احمد آرام کا ترجمہ: احیای فکر دینی در اسلام تہران سے شائع ہوا جس کی متعدد متاخر اشاعتیں بھی ہوئیں۔ اصطلاحات کی جدول بندی اور اشاریے بھی اس پر مزید ہیں اس پر ڈاکٹر سید حسین نصر نے مقدمہ لکھا ہے۔ اس ترجمے کی زبان عالمانہ اور جملے اصل متن کی طرح طویل ہیں۔ محمد بقائی (ماکان) نے کوشش کی ہے کہ جملے بسیط اور مختصر ہوں، حواشی عسیر باتوں کو سمجھا سکیں اور زبان زیادہ سہل اور رسا ہو۔ اس اعتبار سے یہ دوسرا ترجمہ خاصا گرہ کشا اور کامیاب نظر آتا ہے۔ طباعت، جدول اصطلاحات اور اشاریہ و اعلام کا

معیار بھی حفظ کیا گیا ہے۔فلسفے کے طلبہ تعلیقات اور حواشی سے خاصے مستفید ہوں گے۔ یہاں میں مترجم کے ابتادیئے کا ایک اقتباس اردو میں منتقل کر کے پیش کر رہا ہوں۔

۔۔۔اس کتاب کے مصنف علامہ محمد اقبال کا نام ہر پڑھنے لکھنے ایرانی کے لیے اتنا مانوس ہے کہ ان کا تعارف اور احوال لکھنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ شخصیت اقبال کی مختلف جہتیں ہیں وہ شعر گوئی، تفکر و فلسفہ کی ممتاز استعداد رکھتے تھے۔ایک طرف آپ کی شاعری فلسفیانہ اور معاشرتی مصلحانہ افکار سے معمور ہے اور دوسری طرف آپ کے فلسفے میں شعر کی دلربائی اور دل آویزی ملتی ہے۔اقبال کو محض شاعر یا فلسفی قرار نہیں دے سکتے۔وہ ایک عظیم معاشرتی مصلح بھی تھے۔ان کی سرزمین کو مغربی استعمار نے دبوچ رکھا مگر اقبال اپنی نثر و نظم کے ذریعے معاشرتی اصلاح کی کوششوں میں سرگرم رہے۔ان کی تعلیم کا مرکزی نقطہ اسلامی تعلیمات کی اسس پر مبنی خودی یا خودشناسی کا درس تھا۔وہ ہر کہیں،، برصغیر مادی فضا میں بھی شمع اسلام کے پروانے بنے رہے۔دین مبین اسلام پر پختہ ایمان و ایقان نے ان کی فکر کو بھی استوار اور مثبت رکھا۔اس ایمان و ایقان کا مظہر یہ کتاب، بازسازی اندیشہ دینی در اسلام بھی ہے اور کئی حضرات اسے اقبال کی عظیم ترین کارنامہ بتاتے رہے ہیں۔

یہ کتاب سات خطبات یا تقاریر پر مشتمل ہے۔اس کا اسلوب بھی خطابیہ ہے اس لیے اس کی نثر کسی قدر مشکل ہوگئی کیونکہ فلسفیانہ ہیں اور اصطلاحات جن جابجا ملتی ہیں۔ دوسرے متعدد فلاسفہ اور متفکرین کے ذکر اور ان کے افکار کے حوالوں اور منقولات نے تفہیم مطالب کو اور بھی مشکل بنا دیا ہے کیونکہ ان مباحث کو صحیح سمجھنے کے لیے مصنف و ناطق کے جملہ اشارات سے آگاہی ضروری ہے۔راقم نے ترجمے کو آسان اور حوالوں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ یاددہانی اس لیے کرواتا

ہوں کہ کتاب سرسری اور معمولی نہ سمجھی جانے اور اس کا ہر لفظ اور جملہ پڑھنے والے یہ احساس رکھیں کہ اس پیش کرنے والا وہ شخص تھا جسے ''علامہ'' کا محترم لقب ہر صورت بیان میں سزوار ہے۔

ڈاکٹر عشرت حسن انور کی کتاب ''مابعد الطبیعہ از دید گاہ اقبال'' کا ترجمہ: مابعد اطبیعات (مٹافزکس) کو فارسی داں ماورائیب طبیعت بھی لکھتے اور بولتے ہیں۔ اقبال کا ڈاکٹریت کا مقالہ ایرانی مابعد الطبیعات کے ارتقا کے بارے ہی میں تھا۔ حضرت علامہ ماورائی افکار سے کچھ بیزاری کے باوجود اس موضوع سے کاملا دست کش نہ ہوسکے تھے۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور نے اس موضوع پر ڈاکٹریت کا مقالہ لکھا تھا جسے اقبال اکادمی پاکستان نے اردو میں ترجمہ کروا کر شائع کیا ہے (مترجم ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی) محمد بقائی (ماکان) نے اس کا فارسی ترجمہ کروایا اور اس پر مفید حواشی بھی لکھے ہیں۔ ۲۲۴ نسخوں کی تعداد ۳۳۰۰، سال اشاعت ۱۹۹۱ء حکمت پبلی کیشنز خیابان انقلاب کوچہ اول ابوریحان، تہران

اس کتاب کے سلسلے میں مترجم نے ڈاکٹر نبی بخش قاضی معاونت کا شکریہ ادا کیا اس طرح اقبال اکادمی پاکستان کے معاون ناظم وحید اختر عشرت کا بھی جنھوں نے مترجم کو کتاب کی فوٹو کاپہ بھجوائی تھی۔ اس کتاب کی اہمیت کے بارے میں مترجم نے مقدمے میں لکھا ہے۔:

''خطبات اقبال اس دور میں تفکر اسلامی پر ایک عالمانہ کتاب ہے۔ اقبال شناس حضرات ان کی توضیحات پیش کرتے رہیں ہیں کہ اقبال نے خدا، انسان اور کائنات کے ربط اور تفکر اسلامی کی مختلف جہات کے بارے میں اپنا نقطہ نظر کس طرح پیش کیا ہے۔ اقبال کے مابعد الطبیعاتی افکار پر ڈاکٹر عشرت حسن انور نے خوب لکھا، مگر انہوں نے فرض کر کیا کہ ان کے قاری خطبات اقبال پڑھ چکے ہیں اور ان کے فسفہ خاص سے آگاہ ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ کتاب کے اشارات کو خطبات

اقبال کے حواشی نقل کر کے واضح کریں کیونکہ مصنف نے ہیگل، نطشے اور برگساں وغیرہم ایسے فلاسفہ کی کتب کے حوالے دیئے ہیں جو فارسی میں ہنوز ترجمہ نہیں ہوئیں...... ظاہر ہے کہ مختصری اس کتاب کو ترجمہ کرنے میں مترجم کو خاصے صبر اور حوصلے سے کام لینا پڑا ہے۔

چند مقالوں کا ترجمہ وتدوین بسلسلہ رومی نطشے اور اقبال:

اس موضوع پر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا انگریزی مقالہ معروف ہے۔ نطشے اور اقبال کے تقابل پر انگریزی میں ایک مقالہ ڈاکٹر سید نعیم الدین نے لکھا اور ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام نے رومی و اقبال کے حوالے سے فارسی میں، ماکان صاحب نے انگریزی مقالات کو فارسی میں منتقل کیا اور تینوں مقالات کے مشترکات کی تلفیق کر کے سود مند توضیحات کے ساتھ ایک عمدہ مجموعہ بنا دیا ہے۔

اس مجموعے کا حاصل وہدف یہ دکھانا ہے کہ نطشے کا تصور فوق البشر، اقبال کے تصور انسان کامل سے میل نہیں کھاتا بلکہ اقبال اس معاملے میں گوئٹے با نطشے سمیت بعض دوسرے جرمن فلاسفہ کے افکار کے بعض اجزا پسند کرنے کے باوجود مسلم مفکرین خصوصاً رومی کے قریب ہیں۔ فریڈرک نطشے اور اس کے ہم نوا جنون قوت کے جویا رہے جبکہ رومی یا اقبال وغیر کا انسان برتر اعلیٰ جسمانی اور روحانی اوصاف کا حامل ہے۔ ماکان نے اپنے حواشی میں اقبال کے فارسی اشعار سے بالخصوص استشہاد کیا۔ آخر میں اشاریے کے علاوہ اصطلاحات فلسفہ کی انگریزی اور فارسی حروف تہجی کے اعتبار سے سودمند جداول اور فہارس مرتب شدہ ملتی ہے۔ مقدمہ کتاب میں مولف اور مترجم کے اسلوب کار کی توضیح ملتی ہے:

علامہ محمد اقبال...... وہ مفکر ہیں جن کا نام ہماری سرزمین کی زبان وفرہنگ سے مربوط ہے۔ اور اس نام سے ایران کی ثقافت اور تاریخ و ادب کی خوشبو مشام خاطر کو معطر کرتی ہے۔ نصف صدی سے (زیادہ عرصے سے) ایران میں اقبال کے

بارے میں کتب و مقالات لکھنے اور شائع کرنے کس سلسلہ جاری ہے۔لیکن اب بھی ان کے بارے میں کئی باتیں گفتنی نظر آتی ہیں۔ایران کے فرہنگ اور منطقے کے مفکرین کی تکریم کی خاطر یہ کام ضروری ہے کیونکہ اقبال کے تفکر کی تکریم ہمارا اعتبار ہے اور ہمارے فرہنگ کو محترم ماننے والے کسی شخص کو زیب نہیں دیتا کہ وہ مقام اقبال کو گھٹانے کی سعی کرے۔کئی جہات اقبال ہنوز شناخت ہوئی ہیں کیونکہ معاندان کے بارے میں عجیب طرح کی باتیں کرتے ہیں۔کئی اقبال کی تعظیم صوفیا کے ناقد ہیں کہ اس فضائی تسخیر کے زمانے میں بایزید، سطامی اور حسین بن منصور حلاج کو اہمیت کیوں دی جائے۔بعض ان کے چین اسلامی نظریات کے حوالے سے ان کی رجعت پسندی کی باتیں بناتے ہیں۔بعض ان کے تصور خودی کو فشٹے اور نطشے وغیر ہما کے افکار کی بازگشت بتاتے ہیں بعض سرسری مطالعہ کرنے والے انہیں انگریزوں کا مقلد اور گمراہ فرقوں کا حامی بناتے رہے۔اور کچھ امام جعفر صادق رضی اللہ تعالی عنہ کا مخالف (جبکہ اقبال نے جعفر بنگالی کے خلاف لکھا ہے)۔بہرطور افکار اقبال کی حقیقی نقاب کشائی کا کام ابھی باقی ہے۔اور عظیم فلاسفہ کی سی ان کی قدر و منزلت کے مراحل ابھی طے ہونے ہیں۔ایسے کام انجام دینا ہم ایرانیوں کا بھی دین ہے کیونکہ اقبال ہمارے ہم کیش، ہم مشرب اور ہمدل و ہم زبان ہیں۔یہ مجموعہ مقالات جو تین مآخز سے لیا گیا، اس کا ہدف یہ ہے کہ فکر اقبال کے بعض پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے اور شاعر کے تفکر کے منابع کے بارے میں عمدا یا غیر عمدا جو غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں۔ان کا ایک حد تک ازالہ کیا جائے تا کہ فارسی زبان اقبال خواں صحیح صورت احوال جان سکیں۔۔

بشیر احمد ڈار مرحوم کے حواشی ،،مثنوی پس چہ باید کرد،، کا فارسی میں ترجمہ

’’مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق‘‘ کوئی سوا پانچ سو ابیات پر مشتمل کتاب

ہے جس میں افکار اقبال کا خلاصہ ملتا ہے۔ یہ مثنوی پہلی بار ۱۹۳۶ء میں طبع ہوئی۔ اس کے فرنگی مدنیت اور پالیسیوں کے خلاف اشعار نے برصغیر کی انگریزی استعماری حکومت کو بالخصوص حضرت علامہ سے متوحش اور ناراض کر دیا تھا (دیکھیں حیدر آباد دکن کے مجلّہ اقبال ریویو بابت ۱۹۸۴ء کی خصوصی اشاعت میں مجدد شائع کیا گیا)۔ بشیر احمد ڈار کی اس کتاب کا انگریزی میں تحشیہ شدہ ترجمہ اقبال اکادمی پاکستان نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا تھا۔ محمد بقائی ماکان کو یہ مفید ترجمہ ہاتھ لگا اور اس کے حواشی کے ترجمے میں انہوں نے ایرانیوں کے لئے اپنے توضیحی اشارات کا اضافہ کر کے شائع کروا دیا ہے۔ یہ مثنوی اپنے مخالف فرنگ لہجے کی وجہ سے ایرانیوں کو بالخصوص پسند ہے کیونکہ اس عصر میں ایسی مہیج صد شاید ہی کسی نے محدود پیانے پر بلند کی ہو کہ:

آدمیت زار نالید از فرنگ
زندگی ہنگامہ چید از فرنگ

گرگے اندر پوستین برہ ء
ہر زمان اندر کمین برہ ء

مشکلات حضرت انسان ازوست
آدمیت را غم پنہاں ازوست

در نگاہش آدمی آب و گل است
کاروان زندگی بے منزل است

دانش افرنگیاں تیغے بدوش
در ہلاک نوع انسان سخت کوش

با خساں اندر جہان خیر و شر
در نسازد مستی علم و ہنر

آہ از افرنگ و از آئین او
آہ از اندیشۂ لا دین او

علم حق را ساحری آموختند
ساحری نے کافری آموختند

وای از افرنگ و از کار فرنگ
تا کجا در قید زنار فرنگ؟

زخم ازو نشتر ازو سوزن ازو
ما و جوئے خون و امید رفو

آں جہاں بانے کہ ہم سوداگر است
بر زبانش خیر و اندر دل شر است

گوہرش تف دار و در لعلش رگ است

مشک این سوداگر از ناف سگ است

ہوشمندے از خم او مے نخورد
ہر کہ خورد اندر ہمیں میخانہ مرد

محمد بقائی ماکان اکثر ایرانیوں کی طرح منقولہ بالا اشعار سے بالخصوص اثر پذیر ہوئے ۔اس لیے راقم نے بغرض حوالہ انہیں نقل کردیا۔اس مثنوی کے حواشی کا ترجمہ ۵ہزار نسخوں کی تعداد میں شائع ہوا۔

انتشارات اکبانان تہران،۱۳۶۹ش ۱۹۹۰ء صفحات ۱۵۶۔

ترجمہ: حواشی وتوضیحات بشیر احمد ڈار بر مثنو یہائے گلشن راز جدید

بندگی نامہ:

علامہ محمد اقبال کی یہ دونوں مثنویاں ''زبورعجم'' کے ضمائم ہیں (اشاعت اول ۱۹۲۷ء)۔ان کا انگریزی ترجمہ مع حواشی بشیر احمد ڈار نے ۱۹۶۴ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے زیر اہتمام شائع کروایا تھا۔مترجم چونکہ فلسفہ دان اور تصوف شناس تھے،لہذا ان کے حواشی نے محمد بقائی ماکان کو متاثر کیا جنھوں نے انہیں ترجمہ کرکے مع اپنے اضافی تعلیقات فارسی میں شائع کروادیا۔انتشارات اکبانان، تہران ۱۳۶۸ ،۱۹۸۹ء صفحات ۲۲۲،تعداد مطبوعہ نسخے ۳ہزار۔مترجم کو اس کتاب کی نقل بھی ڈاکٹر وحید عشرت نے فراہم کرکے ایک خدمت انجام پا جانے میں تشکر پزید معاونت کی ہے۔مترجم نے ''گلشن راز جدید'' پر زیادہ توجہ دی۔انہوں نے اصطلاحات کے معانی لکھے اور انگریزی اور فارسی میں ان کی الفبائی ترتیب سے جدول بندی کی ہے۔ بندگی نامہ کے حواشی میں مترجم نے اقبال کا تصور فن پیش کیا ہے۔ذیل کے شعر کی تلمیح وہ سیف الدین سوری سے منسلک کرگئے جبکہ اقبال نے برصغیر کے افغان بادشاہ شیر شاہ سوری کی تعمیرات کی طرف اشارہ کیا ہے

خیز و کار ایک و سوری نگر
وانما چشمے اگر داری جگر

مترجم نے ''گلشن راز جدید'' میں اقبال کے فلسفہ خودی کو واضح کیا جو ''گلشن راز'' نوشتہ شیخ محمود شبستری تبریزی (۷۲۰ھ) کے منتخب سوالات کے جواب کا موجب بنا تھا۔ مقدمے کے ایک حصے کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔ دیکھیں مترجم ہدف اقبال کے کتنے شناسا دکھائی دیتے ہیں:

''شیخ محمود شبستری تبریزی۔۔۔ اس پر آشوب اور غم انگیز زمانے کے شاہد تھے جس کے بعد اسلامی فرہنگ و ثقافت تدریجا زوال و انحطاط سے دو چار ہو گئی۔ ہلاکو خان کے ہاتھوں ۶۵۵ھ ۱۲۵۸ء میں بغداد کی جو تباہی ہوئی، اسے اتنا ہی نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ کوئی فوجی یا سیاسی شکست تھی یا جس سے مسلمان خلفاء و سلاطین کا فلاں سلسلہ خاتمہ پذیر دکھائی دینے لگا۔ یہ ان امور سے عظیم تر سانحہ تھا مگر اس الم انگیز واقعے کے صرف ۴۰ سال بعد ہلاکو خان کی اولاد اسلام کی اس قدر گرویدہ ہوئی کہ اس دین کی باعصبت حامی اور مروج بن گئی۔ اس طرح اپنی سیاسی اور اجتماعی حالت بہتر بنانے لگے۔ لیکن سیاسی قوت کی پشتیبانی کے باوجود مسودات کتب کے ضیاع اور علماء دانشمندوں کے قتل عام سے اسلامی فرہنگ و ثقافت کے جو نقصان پہنچا اس کی تلافی امکان پذیر نہ تھی۔ اخلاقی اور معنوی فضائل کا جو زوال ہوا۔ اس سے لوگوں میں اعتماد اطمینان کے اوصاف نہ رہے۔ جیسا کہ ابن اثیر (عز الدین محمد ۶۳۰ھ) نے ''کامل التواریخ'' میں لکھا ہے کہ منگولوں کے خوف سے لوگ غیر معمولی طور پر بزدل اور بے ہمت ہو گئے تھے۔۔ فکری جمود اور جسمانی اذیتوں کی اس افسردگی آمیز ماحول میں شیخ محمود شبستری نے مثنوی ''گلشن راز'' لکھی جس میں وحدت الوجود کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس دوران کے شعراء میں عطار، اوحدی کرمانی اور عراقی تھے۔ ا ن سب نے ابن عربی اندلسی (۶۳۸ھ) کے اس نظریے کو مقبول عام بنانے کی

کوشش کی مگر اقبال کو قرآن مجید کی آیات کی وحدت الوجودی تاویل پسند نہ آئی (دیکھیں تہران یونیورسٹی کی طرف سے شائع کردہ مارچ ۱۹۸۶ء کی اقبال کانفرنس کی گزارش ''درشناخت اقبال'' صفحہ ۱۸۹ء)۔ اس نظریے کی بنیاد یہ کہ کہ ماسوا میں تعدد و تکثر ہے مگر وہ حقیقی وجود سے عاری ہے۔ حقیقی وجود اس ذات یگانہ کا ہے جس کی ہر دوسری چیز پرتو ہے۔ بات سادہ ہے مگر وحدت الوجود کے قائل عرفاء و صوفیاء نکتہ آفرینی کرتے رہے کہ حقیقی او مطلق فاعل اللہ ہے جبکہ انسان تقدیر و سر نوشت کے ہاتھ میں ایک آلہ ء بازی ہی ہے۔ اس احساس کا مٹ جانا ہی احسن ہے وگرنہ انسان اس دنیا کے امور سے بدل بستگی دکھانے لگے تو وہ اپنے فرض منصبی سے دور جا پڑے گا۔ انسان کا فرض یہ ہے کہ خود کو ہیچ جانے اور وہم کی اساس پر مبنی دنیا کی قیدوں اور پابندیوں سے آزاد رہے۔ اس سے وہ بوقت موت ذات واحد سے متصل ہو سکے گا جو اس کی نجات اور جزائے اخروی کی ضامن عمل ہے۔ خدا کے ساتھ اتصال و اتحاد دنیا میں بھی ممکن ہے بشرطیکہ ہماری زندگی علائق سے آزاد ہو اور ہماری آرزوئیں اور مقاصد مٹ چکے ہیں...... علامہ اقبال اپنے عصر میں زیادہ پر صعوبت اور مشکل حالات سے دوچار رہے اس لیئے انہوں نے ایسے گمراہی آمیز منفی اثرات مٹانے کی بہت کوشش کی۔ منگولوں کے حملے کے نتیجے میں مسلمانوں کی سیاسی و اجتماعی قوت کو نقصان تو پہنچا تھا مگر ان لوگوں کے پاس کوئی دوسرا فکری نظام نہ تھا جسے وہ پیش کرتے لہذا وہ جلد اسلام کے مطیع ہو گئے۔ اور دین کو قلبا قبول کر لیا۔ اقبال کی معاصر مغربی تہذیب کا معاملہ دوسرا تھا۔ یہ قوت دین بالخصوص دین اسلام کے خلاف صف آرا تھی اور اس صورت حال سے ہر دل سوز فکر مند تھا اور اس کا میدان دل ایک کارزار بنا ہوا تھا۔ بدقسمتی سے عالم مغرب کے تصورات مادیت پر مبنی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام دشمنی پر بھی۔ مخالفت اسلام کی وجہ غالبا مسیحت اور اسلام کی صدیوں پہلے کی سیاسی اور دینی کشمکش کی بنا پر ہو۔ مغربیوں کی جدید جہاں

بانی کی ایک خصوصیت یہ کوشش دکھائی دیتی ہے کہ دنیا بھر میں مسلمانوں کو نیچا دکھائیں اور ان کا استیصال کرتے رہیں۔علامہ اقبال اقوام مغرب کے ان عزائم سے بخوبی آگاہ تھے اور "مثنوی گلشن راز جدید" کی تمہید میں دانائے تبریز (شیخ محمود)اور اپنے مصائب عصری کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

گزشت از پیش آن دانائے تبریز
قیامتہا کہ رست از خاک چنگیز

نگاہم انقلابے دیگرے دید
طلوع آفتابے دیگرے دے

ان بارزہ آمیز ایام میں اقبال شیخ محمود کی تقدیر کے آگے بے بسی اور سرسپردگی کے فلسفے کی حمایت کب کر سکتے تھے وہ اپنے نظریہ خودی کا دفاع کرتے ہیں جو انسان کا قوت نما مرکزی جوہر ہے اور جس کے آگے تمام قوائے کائنات سرجم ہو سکتے ہیں۔اقبال مادیت کی تسخیر سے قطع نظر روحانی منازل کی بھول بھلیوں کے قائل نہ ہو سکتے تھے۔وہ روح وجسم اور دین و دنیا کے امتزاج کا درس دیتے ہیں تاکہ زمانے کی رو بدلی جا سکے اور عالم انسانیت کی احتیاجات پوری اور ان کے درد معالجہ پذیر ہو سکیں۔غرض "مثنوی گلشن راز جدید" بھی اقبال کے حیات بخش درد، ولولہ انگیز سعی و کوشش کی محرک اور غیرت مند فلسفے کی حاصل ہے۔۔۔

عبدالرفیع حقیقت متخلص رفیع کی دو کتابیں

رفیع صاحب ایک مسن استاد ادب ہیں۔اب وہ ایک انتشاراتی ادارے کے ناظمین میں سے ہیں۔شرکت مولفان، ومترجمان، ایران، خیابان آفتاب، شمارہ ۲۱ منطقہ و نک تہران۔میرے ٹیلیفون کرنے پر وہ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۰ء کی صبح تہران کے ہنک آزادی آئے اور مجھے ان کتب کا ارمغان پیش کیا۔

''اقبال شرق'' یہ نام معنی ہے یعنی تقدیر مشرق۔ استاد رفیع نے اقبال کو پورے مشرق کی خوش نصیبی بتایا ہے۔ ۲۸۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے ۲ ہزار نسخے بنیاد نیکوکاری نوریانی تہران نے ۱۳۵۸ ش۔ ۱۹۷۹ء میں شائع کروائے۔ کتاب کے کوئی ۸۰ صفحات سوانح اقبال پر مشتمل ہیں اور باقی حصے میں علامہ مرحوم کے فارسی کلام کا انتخاب ملتا ہے۔ مولف نے کلام اقبال کے نئے مناسب عنوانات قائم کئے ہیں۔ خصوصاً دوبیتیوں اور قطعات کے۔ کتاب کا پورا نام ذیلی نام اس طرح ہے: ''شرح احوال و آثار و افکار و اشعار گزیدہ علامہ محمد اقبال'' مولف نے علامہ مرحوم کے رنگارنگ افکار مختصر توضیحات کے ساتھ پیش کئے ہیں۔

''ایران از دیدہ گاہ علامہ اقبال: استاد رفیع کی یہ کتاب ۳ ہزار نسخوں کی تعداد میں اس ادارے نے شائع کی ہے جہاں وہ بطور ناظم کام کرتے ہیں (دیکھیں اوپر ''اقبال شرق'') اور یہ ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مفید کتاب میں ایران قدیم و وسیع کی مطلوبہ شخصیتوں کو مختصراً متعارف بھی کروایا گیا ہے۔ اس تناظر میں جملہ ارباب کمال شامل کئے گئے ہیں جیسے مانی، مزدک، سلمان فارسی، بایزید بسطامی، ابن سینا، معتزلی اور اشعری فلاسفہ، ابوبکر رازی، ابن مسکویہ، امام فخر الدین رازی، ابن حلاج، امام غزالی، اسمٰعیلی مفکرین، ملا جلال الدین دوانی، ملا صدرا، ملا ہادی سبز واری، شاہ ہمدان، شیخ سہروردی مقتول، شمس تبریز ابونصر فارابی ابوریحان، البیرونی اور خواجہ نصیر الدین طوسی وغیرہ ہم۔ البتہ مولف کے منابع اقبال کا فارسی کلیات اور فارسی میں ترجمہ شدہ ان کی دو انگریزی کتابیں سیر فلسفہ در ایران (دی ڈیولپمنٹ ......) اور ''احیائے فکر دینی در اسلام'' (خطبات) ہیں۔ اگر اقبال کے اردو اور دیگر انگریزی آثار بھی ان کے پیش نظر ہوتے تو یہ کتاب زیادہ جامع بن سکتی تھی۔ مثلاً وہ کہنے لگے کہ تعجب ہے اقبال نے فردوسی کا کہیں ذکر نہ کیا۔ میں نے بتایا اردو میں کم از کم دو بار ان کا ذکر اقبال کے ہاں ملتا ہے۔ ''مقالات اقبال'' اور ''بال جبریل'' تو دو

ایسے حوالوں سے استفادہ نہ کر سکنے کا افسوس کرنے لگے۔ مولف نے ہر شخصیت کا ذکر اقبال کے تاثر اور تناظر سے کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے وضاحت بھی پیش کی ہے مثلاً سلطان محمود غزنوی کے بارے میں ان کی ذاتی رائے جو بھی ہو،، انہوں نے تاثر اقبال کا بحوالہ مثنوی ''مسافر ذکر کیا ہے۔

گنبدے در طورف او چرخ مبیں
تربت سلطان محمود است ایں

آنکہ چوں کو دک لب از کوثر بشت
گفت در گہوارہ نام او نخست

زیر گردوں آیت اللہ را یلتش
قدسیاں قرآں سرا برتر جتش

اقبال اور اقبالیات پر متفرق کتب: فلسفہ آموزشی اقبال یعنی ڈاکٹر سید غلام السیدین کی انگریزی کتاب Iqbal's Educational Philosophy کا ترجمہ از عزالدین عثمانی تعارف از فتح اللہ مجتبائی، مطبوعہ انتشارات حکت، تہران صفحات ۳۱۸ (۱۳۶۳ش، ۱۹۸۴ء)۔ اس کتاب کے محمد بقائی ماکان کے ترجے کے زیر اشاعت ہونے کا ہم ذکر کر چکے۔ محمد احمد صدیقی نے اس کا ملخص اردو میں پیش کیا ہے (آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی ۱۹۸۵ء)۔ اس کتاب کا مسودہ مصنف نے ۱۹۳۶ء میں علامہ اقبال کے ملاحظے سے گزارا تھا۔ کسی قدر ترمیم واصلاح کے بعد اس کا کچھ حصہ ۱۹۳۸ء میں سہ ماہی ''اسلامک کلچر'' دکن میں شائع ہوا اور اس سال سے یہ اہم کتاب اب تک کوئی ایک درجن اشاعتوں سے مزین ہو چکی ہے۔ کتاب کے نو ابواب ہیں: شخصیت یا خودی، ارتقائے شخصیت، امتزاج

روح و مادہ ،فرد وملت (خودی و بے خودی) کا رابطہ،تخلیقی ارتقاء،عقل وعشق کا تعلق ، تعلیم برائے کردار، خوب ۔ اسلام کا معاشرتی نظام ار تعلیم اور تخلیقی بصیرت ۔ اس ترجمے کے تعارف نویس فتح اللہ مجتبائی پاکستان اور بھارت میں ایران کے کلچرل اتاشی رہ چکے ہیں اور افکار اقبال کی اہمیت سے خاصے آگاہ معلوم ہوتے ہیں ۔

گزیدہ اشعار فارسی علامہ اقبالؒ: انتخاب ساز وحوشی نویس ڈاکٹر ابو القاسم رادفر ، شائع کردہ ادارہ امیر کبیر ،تہران ،طبع اول ۱۳۶۵ ش ۔ ۱۹۸۶ء طبع دوم ۱۳۶۹ ش ، ۱۹۹۰ ۔

امیر کبیر ایک بڑا اشاعتی اور کتب فروشی کا ادارہ ہے جس کی درجنوں دکانیں ہیں ۔ اس ادارے نے بزرگان شعر و ادب کے انتخابات درسی ضروریات کے تحت نہایت حسین طریقے سے دیدہ زیب کاغذ اور جلد کے ساتھ شائع کروائے ہیں ۔ اس طائفے میں اقبال بھی شامل ہیں ۔ ان کا منتخب کلام دو بار ساڑھے سولہ ہزار نسخوں کی تعداد میں شائع ہوا اور طلبہ میں متداول تر ہو گیا ہے ۔ مرتب سے راقم کی ملاقات ہوئی ۔ میں نے انہیں توجہ دلائی کہ وہ مثنوی گلشن راز جدید اور مثنوی بندگی نامہ کے نشان دادہ (نشان میں نے لگائے تھے) آسان حصوں کا انتخاب بھی اس گزیدہ میں شامل کریں ۔ انہوں نے ایسا کرنے کی ہامی بھری ہے جس کے لیے تیسری اشاعت کا انتظار ہے ۔

ترجمہ نامہ ہا و نگاشتہ ہائے اقبال یعنی بشیر احمد ڈار مرحوم کے مرتبہ Letters and writings of Iqbal (اقبال اکادمی پاکستان اشاعت اول ۱۹۶۷ء دوم ۱۹۸۱ء) کا ترجمہ از عبداللہ ظہیر خیابان احمد آباد مشہد صفحات ۱۰۲ ۔

نومبر ۱۹۸۴ء میں دانشگاہ مشہد کے دانش کدہ ادبیات و علوم انسانی کو اس ادارے کے ایک نامور مفکر استاد مرحوم ڈاکٹر علی شریعتی (۱۹ جون ۱۹۷۶ء) کے نام نامی سے منسوب کیا گیا اور اس موقع پر چند کتابوں کی اشاعت ہوئی جن میں یہ

ترجمہ بھی شامل ہے۔ مترجم کے ہم کار محمد حسین ساکت مشہد میں ایک مجسٹریٹ ہیں اور افکار اقبال کے مداح۔ راقم، مترجم اور ساکت صاحب کا سالہا سال سے شناسا ہے۔ وہ اکتوبر ۱۹۹۲ء میں پاکستان آئے اور راقم سے ملے تھے۔ ساکت صاحب بھی اقبال پر ترجمے اور تحشیے کا کام کر رہے ہیں۔ بشیر احمد ڈار مرحوم کی ترجمہ شدہ کتاب سے اہل پاکستان آگاہ ہیں۔ اس میں اہم خطوط اور تحریریں ملتی ہیں اور اقبال شناسی کے اہم ترحوالے جیسے جاپان میں اقبال شناسی اور حضرت علامہ کا سفر اندلس (جنوری ۱۹۳۳ء)

اقبال شناسی۔ نوشتہ حسن شادوان با مقدمہ استاد سید محمد محیط طباطبائی (۲۱ اگست ۱۹۹۲ء بہ سنہ ۸۹ سال) شائع کردہ ادارہ ت بلیغات اسلامی میوان فلسطین تہران صفحات ۳۰۲ تعداد نسخہ ۵ ہزار طبع اول اوائل ۱۳۷۱ ش، ۱۹۹۲ء۔

یہ تازہ تر فارسی کتاب ''اقبال شناسی'' جس پر راقم نے مجلّہ دانش اسلام آباد میں بھی مختصر تبصرہ کیا ہے (خزاں ۱۹۹۲ء یعنی شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۲ء) مولف نے علی سردار جعفری کی اردو کتاب کی طرح اس کا نام اقبال شناسی رکھا ہے۔ یہ کتاب بعض تسامحات اور زلات کے باوجود جن سے راقم نے مولف کو آگاہ کیا ہے نہایت دلچسپ، جامع اور اہم ہے۔ مولف نے اقبال شناسی کے لفظی اور معنوی مباحث واضح کیے ہیں۔ کتاب کے دو بخش (حصے) ہیں اور ۱۸ فصول۔ حصہ اول کی سات فصول ہیں اور حصہ دوم کی گیارہ۔ بعض عنوانات ملاحظہ ہوں:

حصہ اول، فصل پنجم۔ شعر اقبال کے خاص الفاظ اور اصطلاحات، اقبال کی نئی تراکیب اور ان کے نئے مضامین و مفاہیم۔ ساتویں فصل، اقبال کے قائل وحدت الوجود ہونے کی مدلل تردید۔ یہاں مولف نے ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مرحوم کی کتاب ''اقبال سیرتہ و فلسفہ و شعرہ'' کا ایک طویل اقتباس ڈاکٹر محمد غفرانی کے ترجمے کی رو سے نقل کیا ہے۔ دوسرے حصے کی تیسری فصل اقبال کی انقلابی اسلامی فکر کے

بارے میں ہے۔پانچویں فصل اقبال کے شعری تعہد (کمٹ منٹ) کے بارے میں ہے۔مصنف کی نظر میں اقبال کے سے کمٹڈ شاعر عالم اسلام میں شاذ ہی پیدا ہوئے ہیں۔مولف اقبال کے شعر کو انسانیت کا سرمایہ افتخار بتاتا ہے (صفحہ ۱۸)۔وہ لکھتا ہے کہ اقبال کے الفاظ قوت و شکوہ کے مظہر ہیں اور ان کے افکار پر حرکت و عمل ہیں۔

مثلاً تصوف و عرفان کی وہ شکوہ مندی جو اقبال کو عزیز ہے، کس قدر گرہ کشا ہے کہ

فقر قرآن احتساب ہست و بود
نے رباب و مستی و رقص و سرود

فقر مومن چیست؟ تسخیر جہات
بندہ از تاثیر او مولا صفات

فقر کافر خلوت دشت و در است
فقر مومن لرزہ بحر و براست

زندگی آں را سکون غار و کوہ
زندگی ایں را ز مرگ با شکوہ

(کتاب زیر حوالہ صفحہ ۲۶۶)

مصنف شعر اقبال کو صیغہ پیغمبری سے مزین بتاتا ہے کیونکہ شاعر اسلام جملہ مسائل کا حل مسئلہ توحید سے وابستگی بتاتا ہے۔

دلبری بے قاہری جادو گری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

عاشقی توحید را بر دل زدن
وانگہی دل را ہوبہر مشکل زدن

اس کتاب کے بعض عنوانات یہ ہیں: اقبال کا شعرائے فارسی رومی، سعدی، حافظ اور بہار سے موازنہ، اقبال کا تصور انسان کامل، اقبال اور اتحاد مسلمین، اقبال کا درس خودی، شاعر شمشیر و جہاد، کلام اقبال میں آیات، احادیث اور تاریخی و عرفانی نکات کے اشارات اور تلمیحات۔ سرکاری اداروں میں اشاعت کتب کی ہر کہیں دیر وہو جاتی ہے۔ ''اقبال شناسی'' بھی چار سال بعد شائع ہوئی ہے۔ کتاب بڑی تقطیع (ساڑھے نوضرب ساڑھے چھ س م) پر آفسٹ اور بہترین کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ کتاب لکھے جاتے وقت ایران کے دو مسلم ملکوں کے ساتھ تعلقات کشیدہ تھے۔ ان پر انتقاد بھی شامل کتاب ہے۔ اس کے چند تسامحات (صحیح صورت حال لکھے بغیر) کے چند نمونے مندرجہ ذیل ہیں:۔

ا۔ ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال، اقبال اکادمی پاکستان کے بانی ہیں (صفحہ ۲۱)۔
سید محمد اشرف جہانگیر سمنانی کی کتاب ''جہانگیری'' و ''الطائف الاشراف'' لکھی گئی (۴۳) جبکہ وہ ''لطائف اشرفی'' ہے
۳۔ فارسی کتاب ''اقبال و دیگر شعرا ای فارسی'' میری تالیف ہے (صفحہ ۱۷۲ سطر ۹، ۱۰) مولف نے اس کا انتساب غلط کیا ہے۔
۴۔ سنجرستان کوئی قصبہ نہیں۔ اصل بجز (س ج ز) ہونا چاہیے (حاشیہ ۲۳۲)۔
کتاب کے آخری صفحات پر علامہ اقبال کی فارسی تحریر تحریر کا عکس ہے اور ان کی بعض عمدہ تصاویر جو ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کی محولہ بالا کتاب پر مبنی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کتاب خواندنی ہے۔

منابع اور توضیحات

ا۔ اس سے قبل (صفحہ ۳۹) اور بعد (صفحہ ۵۴) مولف نے صحیح مدعو کن کا ذکر

کیا ہے۔

۲۔ سیاہ پوش۔تلخ بمعنی سیاہ وتاریک بھی ہے۔

۳۔ زیاں کار، دیکھیں نظم ''شکوہ'' کا آغاز۔

۴۔ اکثر ایرانی سید جمال الدین کو اسعد آبادی افغانی کی بجائے اس آبادی ہمدانی لکھتے ہیں۔

۵۔ دینی واخلاقی افکار اور اسمعیلی عقائد۔

۶۔ اقبال شناسی کی اس کتاب کو چند سال پہلے تہران کے عظیم اشاعتی ادارے امیر کبیر نے شائع کیا تھا۔

۷۔ دیکھیں اقبال کی انگیزی نوٹ بک Stray Reflections مرتبہ ڈاکٹر جاوید اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، طبع دوم ۱۹۸۷ء میں Metaphysics پر اقبال کا اظہار خیال۔

۸۔ دیکھیں اس مثنوی کے میرے ترجمے کا تعارف، اقبال شریعتی فاونڈیشن ۱۷ایجرٹن روڈ لاہور ۱۹۹۲ء۔

۹۔ دیکھیں اقبال ریویو (انگریزی) بابت اپریل، سال ۱۹۹۰ء میں میرا مقالہ Iqbal in 50 Volumes of the Islamic Culture.

۱۰۔ توضیح کے لیے ملاحظہ ہو میری کتاب ''اقبال کے تعلیمی نظریات'' گلوب پبلشرز اردو بازار لاہور ۱۹۸۹ء کتاب کا آخری حصہ دیکھا جائے۔

---------اختتام----------